آنکھ مچولی

ستمبر ۱۹۹۰ء

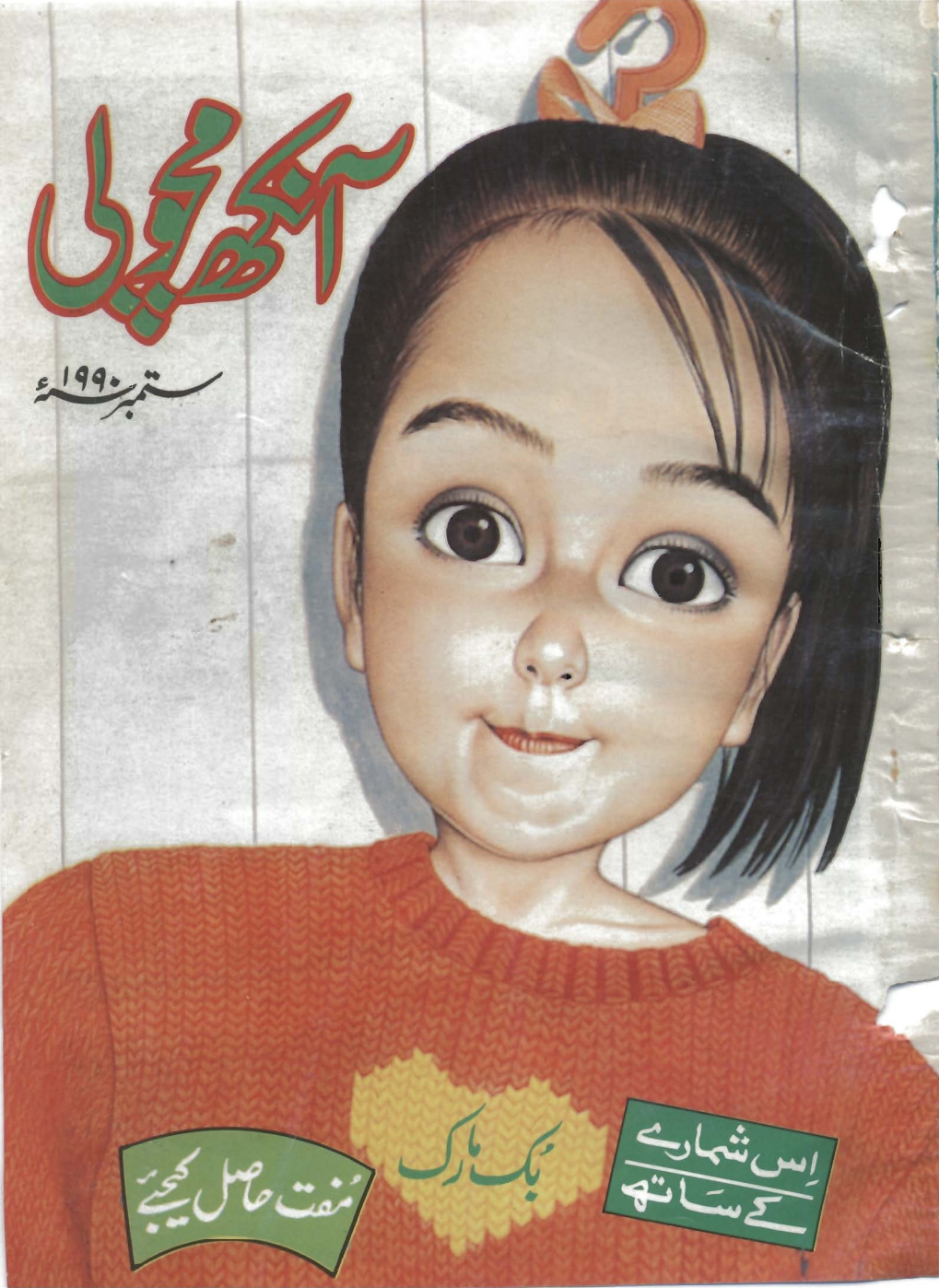

اِس شمارے کے ساتھ

بُک مارک

مُفت حاصل کیجیے

لذّت میں لاثانی ۔ پکانے میں آسانی!

احمد کھیر مکس

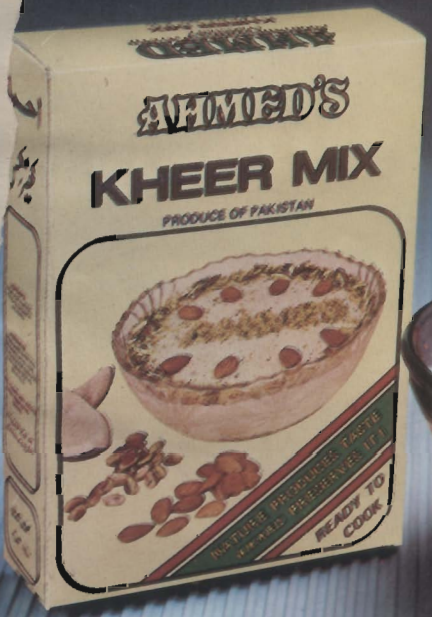

متوازن اور معیاری اجزاء
بہترین اور مثالی صفائی

کا بین الاقوامی معیار آپ کے اعتماد کی ضمانت!

احمد

Scancraft

Pick up a good cause!

BUY ROSE PETAL's

'PANDA PACK'...

When you buy a PANDA PACK of ROSE PETAL TISSUE you save a Panda from extinction

A Product of
Packages Limited

Prestige

"اگر ہم اپنی عظیم ریاست کو شاد و آباد اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے اہلِ قوم، خصوصاً غریب عوام کی فلاح و بہبود پر کامل اور بھرپور توجّہ کرنی ہوگی۔"

آئین ساز اسمبلی پاکستان، کراچی سے
۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کو خطاب

نیشنل بینک آف پاکستان
آپ کی خدمت
ہمارا افتخار

UNITED

PID-I-19/90

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۵ شمارہ ۳ صفر ۱۴۱۱ھ ستمبر ۱۹۹۰ء فون ۔ ۲۹۹۱۷۸۰

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

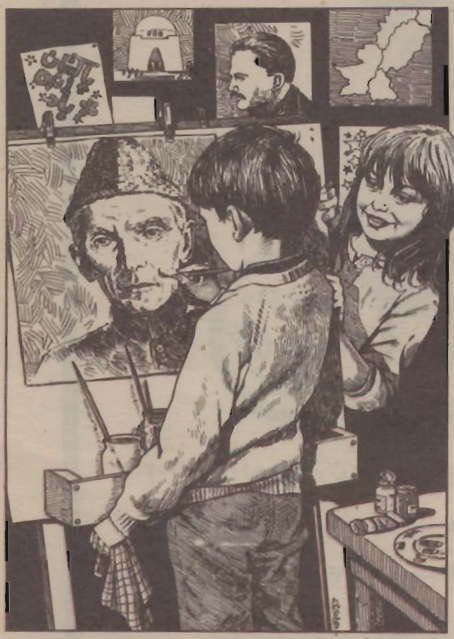

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲ ۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت
۱۰ روپے، ۷ درہم ۷ ریال

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبرشپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف **۱۵۰** روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوادیں

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ -/۳۰۰ روپے

سالانہ ممبرشپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی ساؤتھ کراچی

حسنِ ترتیب

۸ تاریخ کے دریچے سے	(ادارہ)	۷۱ میں نے پاکستان بنتے دیکھا — متین الرحمٰن مرتضیٰ
۹ پہلی بات	(ظفر محمود شیخ)	۷۷ (نظم) ۔ مسٹر عالمگیر — کاشف عرفان
۱۱ ڈیئر ایڈیٹر	(ادارہ)	۷۸ دلدل قسط نمبر ۶ — حمید کاشمیری
۱۷ دوستی	(ناصر احمد چٹھہ)	۸۷ قصہ گو..... — شاہنواز فاروقی
۲۰ پاک زمیں سرسبز بنائیں	(سلمیٰ سلیم)	۹۰ گیارہ دن کا نقصان — ڈاکٹر ریاض الاسلام
۲۳ درویش گورنر	ترجمہ۔ طارق زبیر	۹۲ (نظم)..... چھوڑ گیا — شاہ نواز فاروقی
۲۹ ہم بنے کمانڈو	منیر احمد راشد	۹۴ موت کے بعد زندگی — انتخاب ۔ محمد ظفران
۳۳ کتے (نظم)	(ایک روسی نظم)	۹۹ ایک پارٹی جو..... — کاشان جعفری
۳۴ کچھ حیوانوں کے بارے میں	شمین فاروقی	۱۰۳ ماسٹر جی — سلیم مغل
۳۸ ایک ناگہانی حادثہ	(حادثہ غیم)	۱۰۸ سفر نامہ بھارت — نیاز احمد مدنی
۴۱ عثمان دقنہ	طاہر مسعود	۱۱۵ غزل پزل — اسامہ بن سلیم
۴۹ جنگ ستمبر	علی فرہاد حمید	۱۱۹ دعوت کا بلاوا — غیر ملکی کہانی
۵۲ چکر باز آئینہ	ترجمہ۔ احمد آفتاب	۱۲۳ چند اماموں دور کے — قرۃ العین سلیم
۵۵ ڈنڈا ڈولی	(منتخب لطائف)	۱۲۷ جادو نہیں مگر پھر بھی جادو — کاشف طاہر
۵۹ (نظم) بلّے باز	پروفیسر عنایت علی خان	۱۲۹ کمسن قلم کار — (نئے قلم کاروں کی تحریریں)
۶۱ جہانِ نو	محمد صالح ارشاد	۱۴۷ روشن مثال — (ذہین بچوں کا تعارف)
۶۵ ستمبر کا گمنام ہیرو	غلام عباس طاہر	۱۵۰ امی ابو کا صفحہ — ام رمیشہ اء
۶۷ ایک خط	عمران مشتاق	

تاریخ کے دریچے سے

حضرت ابراہیم ادھمؒ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک روز وہ اپنے دربار خاص میں بیٹھے تھے معاً ایک اجنبی دندناتا ہوا دربار میں آیا اور پوچھنے لگا۔ "کیا میں اس سرائے میں ایک روز ٹھیر سکتا ہوں؟ ابراہیم ادھم نے غصے سے کہا۔ "یہ سرائے نہیں، شاہی محل ہے" اجنبی نے پوچھا "تم سے پہلے اس محل میں کون رہتا تھا؟" ادھم نے جواب دیا "میرا باپ۔" اجنبی نے کہا۔ "ان سے پہلے کون رہتا تھا؟" ادھم بولے۔ "میرا دادا۔" اجنبی نے کہا۔ "تمہارے دادا سے پہلے؟" ادھم نے کہا۔ "میرا پردادا۔" اجنبی نے سوال کیا۔ "اچھا! تمہارے بعد یہاں کون رہے گا؟" ادھم نے کہا۔ "میرا بیٹا۔" اجنبی نے سوال کیا۔ "خود سوچو، جس جگہ اتنے آدمی آئے اور چلے گئے، کیا اسے محل کہنا چاہئے؟" "اتنا کہہ کے اجنبی چلا گیا۔ ابراہیم ادھم تخت چھوڑ کر اجنبی کے پیچھے دوڑے اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔

پہلی بات

ستمبر..... ہاں یہی وہ مہینہ ہے جب ہم نے جانا تھا کہ ہماری قوم کتنی بہادر ہے۔ ہماری مسلح افواج کتنی جواں ہمت ہیں اور ہمارے ملک کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔

اپنے وطن کا دفاع..... ہر حال میں، ہر قیمت پر۔ یہی ستمبر کا پیغام ہے۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ دفاع صرف سرحدوں ہی پر نہیں کیا جاتا۔ سب سے اچھا دفاع تو وہ ہے جو وطن کے اندر رہ کر ہم وطن کے لئے کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں سے وطن کا دفاع۔ جنھیں ساری خرابیاں اسی ملک میں نظر آتی ہیں حالانکہ اسی کے کھیتوں کا اناج ان کی غذا بنی۔ اسی کی چھت کے نیچے انھیں پناہ ملی اور اسی کے سائے میں وہ پلے بڑھے.....

ایسے لوگوں سے وطن کا دفاع جو اپنے وطن کے لئے کوئی قربانی دینے کو تیار نہیں۔ جو اپنے یہاں ہیں اور جن کی نگاہیں امریکہ اور یورپ پر جمی رہتی ہیں کہ ایک گرین کارڈ ملے اور کب وہ اس سنہری مٹی سے پرواز کر جائیں۔

ایسے لوگوں سے وطن کا دفاع جنھوں نے اپنے ہی ملک کو مال غنیمت سمجھ رکھا ہے۔ اور جب بھی انھیں کوئی عہدہ اور منصب ملتا ہے وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اور سیاہ و سفید کے مالک بن جانا چاہتے ہیں۔

ایسے لوگوں سے وطن کا دفاع جو اپنی شہرت کی دکان چمکانے کے لئے وطن کے باسیوں کو طبقوں، گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دینا چاہتے ہیں ان کے پھیلائے ہوئے تعصب کی وجہ سے خون بہتا ہے۔ لوگ مرتے کٹتے ہیں لیکن انھیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔

اور ایسے لوگوں سے وطن کا دفاع جو کاہل ہیں، غیر ذمہ دار ہیں، قانون شکن ہیں، اقربا پرور ہیں، راشی ہیں، سفارشی ہیں اور وہ سب باتیں ان میں موجود ہیں جو اس ملک کے لئے اچھی نہیں ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دفاع کون کرے گا؟ کہا جاتا ہے کہ سارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے۔ نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس معاشرے میں سب بگڑے ہوں وہ معاشرہ قائم نہیں رہتا۔ وہ ملک ختم ہو جاتا ہے۔

آپ یقین جانیئے۔ ہمارے ملک کی اکثریت محبِ وطن ہے۔ وہ اس ملک کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی خرابیوں کو دور کرنے کی خواہش مند ہے اس ملک کا دفاع انہی کی ذمہ داری ہے۔ بلاشبہ آپ بھی انہی لوگوں میں شامل ہیں۔ آگے بڑھیئے اور اس ملک کا دفاع کیجئے..... یہی ستمبر کا پیغام ہے۔!

آپ کا دوست ظفر محمود شیخ

آپ کو کامیابی مبارک ہو

دسویں جماعت کے سالانہ امتحان میں آپ کو کامیابی مبارک ہو۔
یہ کامیابی آپ کا حق تھی
اس لئے کہ..... آپ نے

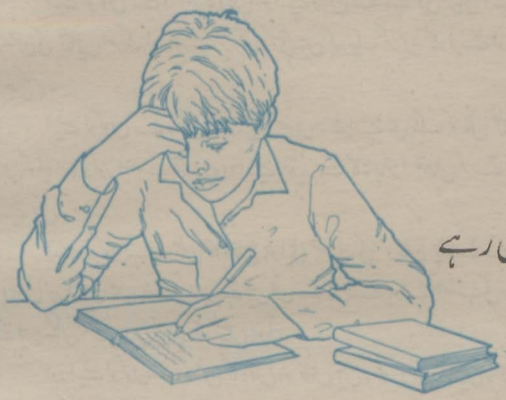

سال بھر محنت کی
پڑھنے سے جی نہیں چرایا
اپنے فرض سے غافل نہیں رہے

آپ کی کامیابی.....
آپ کی محنت کا صلہ اور رب العزّت کا انعام ہے
ہماری دعا ہے کہ آپ دنیا و آخرت کی ایسی لاتعداد کامیابیاں سمیٹیں۔ آمین

○ ..... منجانب ..... ادارہ آنکھ مچولی کراچی ..... ○

ڈیئر ایڈیٹر

تاج محمد عباسی، ٹھٹھہ:۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ میرا خط یا تحریر شائع نہیں کریں گے میں آپ کو خط لکھتا رہوں گا اور آخر کار آپ ایک دن ہار جائیں گے اور میری تحریر شائع کر دیں گے۔ آنکھ مچولی میں آپ سالگرہ کے ساتھی کی جگہ قلمی دوستی شروع کر دیں۔

○ ..... لیجئے ہم ہار گئے۔ سالگرہ کے ساتھی کا انداز بدل دیا گیا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آیا ہو گا۔

محمد علی خان، کورنگی، کراچی:۔ میاں! ہماری پوتی ماشاء اللہ نو دس سال کی ہے۔ آنکھ مچولی پر فریفتہ ہے۔ آپ نے عید کے موقع پر عیدی کے لئے ٹوکن کے ساتھ درخواستیں طلب کیں۔ اس نے چاہت سے ٹوکن لگا کر خط میرے حوالے کیا..... لیکن میاں! آپ نے اپنے نام کے واقف پچاس بچوں کو عیدی دے دی۔

○ ..... محترم بزرگ! جب عید آتی ہے تو کیا آپ ایک بزرگ کی حیثیت سے اپنے تمام عزیز و اقارب، دوستوں اور پڑوسیوں کے بچوں میں عیدی بانٹتے ہیں؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لئے بھی ممکن نہ تھا کہ ہزاروں بچوں میں عیدی تقسیم کرتے۔ اس کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ اپنایا گیا جن بچوں کو عیدی ملی ان سے ہماری اتنی ہی واقفیت ہے جتنی آپ کے بچوں سے۔

حامدون خالدہ او کاڑہ:۔ آپ رسالے کے شروع میں لکھتے ہیں کہ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔

○ ..... بعض اوقات لوگوں کو رسالے کی کوئی تحریر پسند آجاتی ہے تو وہ بغیر اجازت لئے کسی کتاب میں یا

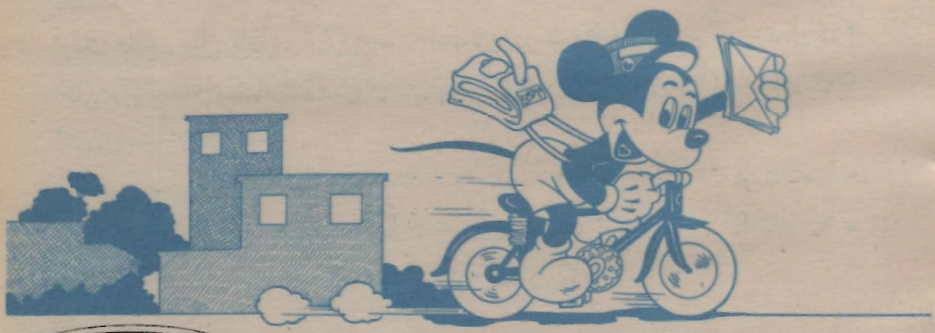

اخبار اور رسالے میں نقل کر لیتے ہیں۔ یہ اخلاقی طور پر اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے احتیاطاً لکھ دیا گیا ہے۔

سلمان جاوید:۔ آپ رسالے میں ہونہار مصور کا سلسلہ شروع کیجئے اور موضوعات ایسے ہوں جس سے معاشرے کی اصلاح ہو یا تصویروں کی بجائے کارٹون ہوں۔ اس سے ساتھیوں میں مصوری کا شوق بڑھے گا اور معاشرے کی اصلاح ہوگی۔

○ ..... مشورے اچھے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ آنکھ مچولی ہمیشہ جدت کو پسند کرتا ہے۔ ہونہار مصور وغیرہ کا سلسلہ کئی رسالوں میں پہلے سے چل رہا ہے۔ مصوری کے حوالے سے کوئی انوکھی سی تجویز سوچئے۔

مبین احمد، کراچی:۔ آنکھ مچولی کے سرورق پر پھولوں اور منظروں کی تصویریں شائع کیجئے۔ اس سے آنکھ مچولی کے معیار پر اچھا اثر پڑے گا۔

○ ..... آپ کا رسالہ تو اپنے سرورق ہی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ایسا سرورق کسی رسالے کا بھی نہیں ہوتا۔ آپ اس کو تبدیل کرانا چاہ رہے ہیں۔

نعمان بن ناصر، سکندر آباد، کراچی:۔ میں علماء کرام، استادوں اور سماجی کارکنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پاکستان میں رہنے والے تمام بھائیوں کے اختلافات کو ختم کرانے کی سچے دل سے کوشش کریں۔ میں یہ بھی التجا کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کو تباہی و بربادی سے بچایا جائے ورنہ ہمارے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔

○ ..... لٹل اسکالر دنیا کے کم سن مقرر اعظم صاحب! (یہ القابات آپ نے خود اپنے نام کے ساتھ لکھے ہیں) آپ کی یہ درد مندانہ اپیل شائع کر دی گئی ہے۔ اب آیئے دعا کریں کہ اس کا کچھ اثر بھی نکلے۔

فرحانہ جاوید، دہلی کالونی، کراچی:۔ رسالے میں دیر سے حاضری کی وجہ یہ تھی کہ میری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی لئے کچھ لکھنے کو دل ہی نہیں چاہا۔ ابھی ابھی پچھلے پرچے دیکھے تو اس میں کچھ غلطیاں ملیں اسی لئے قلم اٹھایا ہے۔

○ ..... آپ کی والدہ کے انتقال کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ ماں کا سایہ سب سے گھنا اور اس کی چھاؤں سب سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ آپ نے جن غلطیوں کی طرف نشاندہی کی ہے اس پر آپ کے شکر گزار ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی توجہ دلاتی رہیں گی۔

امریکہ سے ایک خط

عالی جمالی صاحب آنکھ مچولی کے آرٹسٹ تھے۔ کہانیوں پر خوبصورت اسکیچز ان ہی کے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے۔ ان بہت سارے پاکستانیوں کی طرح جو ایک بہتر مستقبل کے لئے اپنے ملک کو چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن باہر جا کر ان کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ عالی جمالی صاحب کے خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی کے نام لکھا۔ آپ کی دلچسپی اور معلومات کے لئے ان کے خط کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

"سب سے پہلے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اپنے گھر کی چھت ٹپکنے لگے تو گھر نہیں چھوڑتے۔ بس ہم اپنی زندگی کا سب سے بڑا غلط فیصلہ کر بیٹھے۔ یہاں سب کچھ ہے لیکن کچھ بھی نہیں۔ نہ اپنا ماحول، نہ اپنے لوگ۔ نہ کوئی عالی بھائی کہتا ہے، نہ کسی کو سلام علیک کہنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیجئے دل کی تسلی کے لئے (یہاں آنے کو) مصلحت سمجھ لیا ہے۔ انجم میری بیوی کافی کمزور ہو گئی ہیں۔ مستقل گھر میں رہتی ہیں۔ کوئی ملنے والا، بات کرنے والا نہیں۔ بچے صبح اسکول جاتے ہیں اور چار بجے شام واپس آتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کا بھی دل یہاں نہیں لگا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا ہے کہ دو سال بعد کاشف کا ہائی اسکول مکمل ہوتے ہی واپس اپنے وطن کا سفر اختیار کریں گے۔ اس وقت ہم سب کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ایک مرتبہ پھر اپنے پاکستان پہنچ جائیں۔ اپنی مٹی کو سجدہ کریں اور کبھی جدا نہ ہوں ......"

ALEE J. JAVAED

فہد احمد، ملتان۔ اگست کے پیارے شمارے میں آپ نے بلیک بکس میں تین ساتھیوں کے نام چھاپے لیکن رفعت ہمایوں اور محمد جاوید خالد کے نام بلیک بکس میں یہ کہہ کر نہیں لکھے کہ یہ ساتھی ہمیں بہت عزیز ہیں تو کیا وہ ساتھی جن کے نام آپ نے بلیک بکس میں چھاپے ہیں وہ آپ کے سوتیلے تھے۔

○ ...... اچھے دوست! آپ نے ہمارا جواب غور سے نہیں پڑھا۔ دیکھئے گھر میں اگر چھوٹے غلطی کرتے ہیں تو انہیں سزا ملتی ہے مثلاً ان کی پٹائی وغیرہ ہو جاتی ہے اور بڑے غلطی کریں تو انہیں سخت سست کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہ لکھنے والے، سینئر تھے ان کے لئے یہی سزا بہت کافی تھی کہ انہیں بھری محفل میں یہ سب کچھ

سننا پڑا۔ اس میں سوتیلے اور سگے کی کوئی بات نہیں ہے۔

محمد فیصل محسن، ماڈل کالونی، کراچی:۔ آنکھ مچولی کو سب سے اچھا رسالہ ہونے کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ بقول آپ کے یہ کامیابی ہماری ہے اور یہ رسالہ ہمارا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میرے کئی خط اور پچھلے ماہ بھیجا ہوا زبردست لطیفہ کب کا شائع ہو چکا ہوتا۔

○ ..... بلاشبہ۔ یہ رسالہ آپ کا ہے۔ اور آپ کے رسالے کا معیار بلند رکھنے کے لئے ہمیں دل پر پتھر رکھ کر صرف ایسی ہی تحریریں منتخب کرنی پڑتی ہیں جنہیں پڑھ کر آپ کا دل خوش ہو جائے۔

زرینہ حیدر، وہاڑی:۔ آپ کی شرائط میں شامل ہے کہ کچھ لکھنے سے پہلے آپ سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہے اسی لئے آپ سے اجازت لینے کے لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے امید ہے میرا نام بھی آپ مستقل لکھنے والوں کی فہرست میں شامل کر لیں گے۔

○ ..... آپ نے رسالے میں یہ شرط کہاں پڑھ لی۔ آنکھ مچولی میں لکھنے کی صرف ایک ہی شرط ہے "کم لکھو، اپنا لکھو، اچھا لکھو"۔

حفیظ احمد محمد، دوحہ، قطر:۔ ہم نے پاکستان کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ ہماری پیدائش دوحہ کی ہے گو ہماری پیدائش یہیں کی ہے لیکن پاکستان کی کوئی چیز دیکھ لیں تو خوش ہو جاتے ہیں۔ عیدی حاصل کرنے کے لئے اور غرل پزل میں حصہ لیا تھا مگر کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

○ ..... پاکستان سے آپ کی محبت قابل رشک ہے کہ پاکستان کو دیکھا نہیں اور اس سے محبت محسوس کرتے ہیں۔ آنکھ مچولی میں مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی مکمل صحیح جواب اور کبھی قرعہ اندازی کے ذریعے کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی آپ کو بھی کامیابی مل ہی جائے گی۔

عبدالغفار احمد، واربرٹن:۔ رسالے کے سرورق میں یکسانیت آگئی ہے۔ ہر دفعہ کا ٹائٹل تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ تبدیلی لائیں۔ مثلاً کبھی کسی عمارت، کسی منظر کی تصویر دے دیا کریں۔

○ ..... ٹائٹل کی شکایت پر ہمیں تعجب ہوا۔ ویسے اگر روز روز بریانی کھائی جائے تو کبھی کبھی دال کھانے کی فرمائش بھی ہونے لگتی ہے۔

سیدہ کاشفہ خاتون نقوی، نارتھ کراچی:۔ سرورق لاجواب تھا۔ "ماہ رواں کی پہلی بات" اچھی تھی۔ خطوط پڑھے تو بہت غصہ آیا کیونکہ خطوں میں تعریف کم اور شکایتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جون کے شمارے میں "میلے آنسو" بہت پسند آئی۔

○ ..... کاشفہ بی بی! بات یہ ہے کہ ہم ان صفحات میں شکایتوں کو ہی زیادہ جگہ دیتے ہیں۔ اپنے

رسالے میں اپنی تعریف چھاپنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ پھر اس سے ساتھیوں کی شکایتیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ "میلے آنسو" ہماری ان کہانیوں میں سے ایک ہے جس کی تعریف میں بے پناہ خطوط آئے۔ افسانہ نگار سب کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔

امتیاز علی جہانگیر، لاہور: ۔ جون میں نازیہ جبیں کا مضمون "فیصلہ خود کیجئے" خود بھی پڑھا اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھوایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے سائنس سے آرٹس پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے والدین بھی متاثر ہوئے۔

○ ..... آنکھ مچولی اگر آپ کو تفریح کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی رہنمائی بھی کرتا ہے تو سمجھئے رسالے کا مقصد پورا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ہماری محنت کا صلہ ہے۔

کاغذ نہ موڑیں

کتاب یا رسالہ پڑھتے ہوئے صفحات موڑنا
آپ کی کتاب دوستی کو مشکوک بناتا ہے

کتابیں علمی خزانہ ہیں
کتابیں قیمتی سرمایہ ہیں

ان کی حفاظت کیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی کی طرف سے دیا جانے والا خوبصورت بک مارک
..... ضرورت پڑنے پر استعمال کیجئے۔

یہ خوبصورت بک مارک ..... آپ کے لئے آنکھ مچولی کا تحفہ بھی ہے

اور تحفظِ سرمایۂ کتب کا پیغام بھی۔

manhattan PAKISTAN

از ..... شبیر احمد ناصر ماچھیہ

انسانیت نے ہزاروں سال قبل فطرت کی تمام خوبصورتیوں کو یکجا کر کے جس شے کی تخلیق کی اس کا نام دوستی ہے۔ دوستی اس بہتی ہوئی ندی کا نام ہے جو کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ دوستی میں لالچ اور خود غرضی کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں اخلاق ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ دوستی کو پائیدار اور مستحکم بنانے میں باہمی اعتماد اور محبت بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دوستی کی اہمیت کا اندازہ اس عام رائے سے کیا جاسکتا ہے کہ اچھے دوست خوش بخت لوگوں کو ملتے ہیں۔ یہ بات بھی طے ہے کہ ہر شخص دوست نہیں ہوتا جیسا کہ احمد فراز نے کہا ہے کہ

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

دوست قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ ایک فلسفی نے کہا کہ جب تم کسی کو دوست بنالو تو اس پر کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرو اور نہ ہی اس کے متعلق کسی سے دریافت کرو، اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی سے مشورہ کرو، کیونکہ ممکن ہے کہ تم کو اس کا مخالف مل جائے، جو تم کو تمہارے دوست کے متعلق غلط معلومات فراہم کر دے، یا اس میں ناجائز عیب بتائے یا ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں نفرت کی آگ بھڑکائے۔ جو آپ کے عظیم رشتے کو جلا کر راکھ کر دے۔ خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔ اگر تم دوست نہیں بنا سکتے تو دشمن بھی نہ بناؤ۔

دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے۔ دوستی میں غرض نہیں ہونی چاہئے۔ سوائے اس کے کہ تم اپنے دوست کو دل کی گہرائی سے چاہو۔ اپنے دوست کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ ہو سکتا کہ وہ آپ کی آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور ناجائز طور پر آپ کے دل میں نفرت و حقارت کی آگ بھڑک اٹھے جو آپ کو بھسم کر دے۔ دوست کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔ دوست کی طرف سے تحفے میں دی ہوئی ہر چیز قبول کر لینی چاہئے، چاہے وہ معمولی کیوں نہ ہو۔ اس سے آپ کے دوست کے دل میں آپ کی محبت میں اضافہ ہو گا۔ جس کے باعث تعلقات اور بہتر ہو جائیں گے۔ اگر آپ اپنے دوست پر اعتماد کریں گے تو وہ بھی آپ پر اعتماد کرے گا۔ اعتماد وہ واحد ذریعہ ہے جس سے امیدیں پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ وہ دوستی جو دولت کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو دیرپا نہیں ہوتی۔ مثالی دوستی وہ ہوتی ہے جو آخری سانس تک قائم رہے۔ اگر دوست کی کوئی بات ناگوار گذرے تو اسے اس طریقے سے سمجھائیں کہ اسے دکھ نہ ہو۔ غصہ سے پرہیز کرنا چاہئے۔ عموماً غصے ہی کی وجہ سے دوستی کے ناتے ٹوٹتے رہے ہیں۔ آپ جب حلقۂ احباب میں ہوں تو شگفتہ مزاجی اختیار کریں۔ اپنے دوستوں کو بُرے نام سے نہ پکاریں۔ بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ حلقۂ احباب میں ایسی باتیں کریں جن سے آپ کے دوست آپ کے گرویدہ ہو جائیں۔ اب ہم دوستی کی مناسبت سے آپ کو ایک واقعہ سناتے ہیں۔

ایک شخص نے اپنے دوست کے پاس جاکر دس روپے کی ضرورت ظاہر کی تو اس کا دوست رونے لگا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ تم اپنے دوست کی ادنیٰ سی ضرورت کو بھی پورا نہیں کر سکتے، حالانکہ تمہارے پاس کافی روپے ہیں۔ اس شخص کا دوست اپنی بیوی سے مخاطب ہوا کہ میں تو اس لئے روتا ہوں کہ میں اپنے دوست کے حالات سے بے خبر کیوں رہا، اس کی ضرورت زندگی کا اندازہ خود کیوں نہ لگالیا کہ آج اسے مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اس نے مجھ سے دس روپے مانگ کر مجھے یاد دلا دیا کہ میں اپنے فرائض دوستی سے بے خبر رہا۔

دوستی کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ دوست اتنے ہی بنائیں جتنوں سے آپ اچھے طریقے سے یہ رشتہ نبھا سکتے ہوں۔ دوست بنانا آسان ہے مگر ان کے ساتھ دوستی کا عظیم رشتہ نبھانا بہت ہی مشکل ہے۔

یاد رکھئے ہر چیز جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم سب اچھا دوست بننے کے لئے کوشش کریں تو انشاء اللہ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔ آیئے دشمنی کے خلاف جہاد کریں۔ دوستی کو فروغ دیں۔ لوگوں کے قلوب سے نفرت کی آگ بجھائیں اور نفرت کی جگہ محبت پیدا کریں۔ کیونکہ اسی طرح ہم اپنے اس پیارے وطن کو امن کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔ ایسا گہوارہ جو پوری دنیا کے لئے ایک مثال ہو۔ آمین

پاک زمیں سرسبز بنائیں
گلی گلی میں پیڑ لگائیں

ہرے بھرے اور گھنی چھاؤں والے درخت دیکھ کر ہمیں اپنے دادا یاد آجاتے ہیں۔ ان کی باتیں ہرے بھرے پتوں کی طرح ہری بھری اور خوش گوار ہوتی تھیں اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنے کا احساس ہوتا تھا

معیاری خوردنی اشیاء کی پہچان
اس کے اجزاء
TASTE AHMED
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
PRODUCE OF PAKISTAN
NET WT. 330g./11.50 oz.
AHMED FOOD INDUSTRIES (Pvt.) LTD.
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

ایک زمانہ تھا کہ انسان ہی انسان کے سب سے زیادہ کام آتا تھا، مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ چنانچہ اب انسان، انسان کے کام نہیں آتا۔ اس وقت دنیا میں جو چیز انسان کے سب سے زیادہ کام آتی ہے، وہ ہے درخت۔ ذرا اپنے اطراف کی چیزوں پر نظر ڈالئے۔ یہ میز، یہ کرسی جن پر بیٹھ کر آپ مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دروازہ جو آپ کے گھر اور آپ کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ چکلا بیلن جس کی مدد سے آپ کی روٹیاں بنتی ہیں، اور یہ ڈھول جو آپ خوشی کے موقعوں پر بجاتے ہیں، سب کے سب کسی درخت کی لکڑی سے بنتے ہیں۔

درختوں سے ہم صرف چیزیں بنانے کا کام ہی نہیں لیتے، بلکہ یہ ہمارے ماحول کو خوبصورت اور خوشگوار بنانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ درخت ہمارے ماحول کی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے زہر کو پی کر ہمیں سانس لینے کے لئے آکسیجن مہیا کرتے ہیں۔

آج دنیا بھر میں انسان کے اس سب سے بڑے دوست کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور یہ سازشیں انسان ہی کر رہا ہے۔ ہر جگہ بڑے

پیمانے پر درخت کاٹے جارہے ہیں اور ان درختوں کی لکڑی کو ایسی اشیاء بنانے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے جو صرف شوپیس کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

ہمارے پاکستان میں بھی بڑے پیمانے پر درخت کاٹنے کا عمل ہو رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ جس مقدار میں درخت کاٹے جارہے ہیں اس مقدار میں درخت لگائے نہیں جا رہے۔ آپ ابھی بہت چھوٹے ہیں اس لئے ہم آپ سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ اگر کسی کو درخت کاٹتے ہوئے دیکھیں تو اسے روک دیں، لیکن ہم آپ سے یہ ضرور کہیں گے کہ آپ نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں، بلکہ ان کے بڑے ہونے تک ان کی دیکھ بھال بھی کریں۔ درختوں کی کثرت سے نہ صرف یہ کہ ملک خوبصورت اور معاشی طور پر خوشحال ہو گا بلکہ جب تک آپ کے لگائے ہوئے درخت لوگوں کو چھاؤں مہیا کرتے رہیں گے آپ کو صدقۂ جاریہ کا ثواب ملتا رہے گا۔ یعنی خدمت کی خدمت ثواب کا ثواب۔ تو آپ درخت کب لگا رہے ہیں؟۔

سلمیٰ سلیمو

درویش گورنر

ایک ایسے گورنر کا سچا قصہ جس کا شمار رعایا کے غریب ترین لوگوں میں ہوتا تھا

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن پاشا　　عربی سے ترجمہ　　زبیر طارق

ہزاروں لوگ مکہ سے باہر تنعیم کے میدان کی جانب جا رہے تھے۔ ان میں ایک نوجوان سعید بن عامر بھی تھا۔ یہ لوگ قریشی سرداروں کی دعوت پر خبیبؓ بن عدی کے قتل کا تماشا دیکھنے جمع ہو رہے تھے۔ جنہیں کافروں نے دھوکے سے گرفتار کر لیا تھا۔

سعید جوش جوانی میں لوگوں کے کندھوں سے کندھا بھڑاتے آگے بڑھے اور قریش کے سرداروں ابو سفیان بن حرب اور صفوان بن امیّہ کے قریب پہنچ گئے۔ اب انہیں خبیبؓ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ عورتوں، بچوں اور جوانوں کا ہجوم انہیں موت کے میدان کی جانب دھکیلے لئے جا رہا تھا۔ وہ بدر کی جنگ میں قتل ہونے والے عزیزوں کے خون کا بدلہ ان کی ذات سے لینا چاہتے تھے۔

لوگوں کی بھیڑ قیدی کو لئے قتل گاہ پہنچ گئی۔ طویل قامت سعید نے ایک نظر خبیبؓ پر ڈالی۔ وہ زمین میں نصب لکڑی کی صلیب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخوں کے درمیان خبیبؓ کی پرسکون آواز بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "اگر کہو تو میں قتل ہونے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لوں....."

ہجوم پر خاموشی طاری ہوگئی۔ خبیبؓ نے کعبہ کی طرف رخ کیا اور پھر گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر وہ ایک پرسکون عالم میں پہنچ گئے۔ نماز مکمل کر کے انہوں نے سلام پھیرا اور اپنی قوم کے سرداروں سے کہا

"بہ خدا میں لمبی نماز پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر پھر اس خیال سے مختصر کر دی کہ کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈر گیا ہوں۔"

اس کے بعد خبیبؓ نے اپنی قوم کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں زندہ ٹکڑے کرنے پر تلی کھڑی تھی۔ چند ثانیے بعد نیزے اور تلواریں حرکت میں آگئیں۔ خبیبؓ کی بوٹیاں اڑنے لگیں۔ ہر وار پر کافر کہتے

"کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے اور تم اپنے گھر میں محفوظ ہوتے۔"

خبیبؓ کا خون بہتا جا رہا تھا اور ان پر کمزوری غالب آ رہی تھی۔ مگر اس حالت میں بھی ان کا ایک ہی جواب تھا۔ "اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ میں امن و اطمینان سے بیوی بچوں کے درمیان ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کانٹا بھی چبھ جائے....."

خبیبؓ کی اس جرات و ہمت پر مجمع بھنّا اٹھا۔ ان کے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ چیخنے لگے! "اسے قتل کر دو..... اسے قتل کر دو....."

سعید بن عامر نے دیکھا۔ خبیبؓ کی نگاہ آسمان کی جانب اٹھی۔ وہ کہہ رہے تھے! اے اللہ! یہ لوگ تیرے شمار میں ہیں۔ ان سے میرا بدلہ لے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑ۔" پھر انہوں نے آخری سانس لی۔ تلواروں اور نیزوں کی پے در پے ضربوں نے ان کا کام تمام کر ڈالا۔

دنیا میں ہر لمحہ نئے واقعات اور حادثات رونما ہوتے ہیں اور انسان پچھلی باتوں کو بھلا دیتا ہے چنانچہ اہل مکہ نے جلد ہی اس واقعے کو فراموش کر دیا۔ مگر نوجوان سعید بن عامر خبیبؓ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دل سے نہ نکال پائے۔ سوتے اور جاگتے وہ انہیں اپنے سامنے پاتے۔ وہ انہیں صلیب کے سامنے نماز پڑھتے دیکھتے۔ ان کے کانوں میں خبیبؓ کے کراہنے کی آواز آتی۔ وہ قریش کو بد دعا دے رہے

ہوتے۔ نوجوان سعید ڈر گئے۔ کہیں آسمان سے بجلی نہ آگوندے یا کوئی چٹان ان پر نہ گر پڑے۔
اس طرح اللہ نے سعید کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔
قبول اسلام کے بعد سعید ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ وہ ہر وقت نبی صلی علیہ وسلم کی صحبت میں رہتے۔ انہوں نے آپ کے ہمراہ خیبر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں حصہ لیا۔ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد سعیدؓ آپؐ کے دونوں خلفاء ابو بکرؓ اور عمرؓ کے ہاتھوں میں ایک سونتی ہوئی تلوار بن گئے۔ انہوں نے ایک بے نظیر زندگی گزاری۔ اس صاحب ایمان کی سی زندگی جس نے دنیا کے بدلے آخرت کو خرید لیا ہو۔

حضرت ابو بکرؓ اور عمر فاروقؓ سعیدؓ کے خلوص اور تقویٰ سے بخوبی واقف تھے۔ وہ کان لگا کر ان کی نصیحتیں سنتے اور ان کی باتوں پر دھیان دیتے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی ایام تھے۔ سعیدؓ ان کے پاس گئے اور کہا! "اے عمرؓ! میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں۔ لوگوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہئے مگر اللہ کے معاملے میں لوگوں سے نہ ڈرئے۔ آپ کا کوئی قول آپ کے عمل کے خلاف نہ ہو اس لئے کہ بہترین قول وہی ہے عمل جس کی تصدیق کرے۔
اے عمرؓ! اپنے فرائض پر بھرپور توجہ دیجئے۔ اللہ نے آپ کو تمام مسلمانوں کا ذمہ دار بنایا ہے ان کے لئے وہی پسند کیجئے جو آپ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے پسند کرتے ہیں۔ ان کے لئے وہ سب ناپسند کیجئے جو آپ کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے ناپسند ہے۔ حق کے لئے سختیاں اور مصیبتیں سہیے اور اللہ کے معاملے میں کسی کی ملامت سے نہ ڈریئے۔"
عمرؓ نے فرمایا! "سعیدؓ! یہ سب کچھ کرنے کی طاقت کس میں ہے؟"
"آپ جیسا شخص ہی یہ سب کر سکتا ہے جسے اللہ نے اس امت کی ذمہ داری سونپی ہے اور اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی بھی نہیں۔" سعید نے جواب دیا۔
کچھ مدت کے بعد حضرت عمرؓ نے سعیدؓ کو بلایا اور کہا! "سعید میں اہل حمص کی ذمہ داری تمہیں سونپ رہا ہوں۔"
عمرؓ! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، مجھے دنیا کی طرف مائل نہ کیجئے۔"
سعیدؓ کی یہ بات سن کر حضرت عمرؓ کو غصہ آگیا اور فرمایا! "تم لوگوں کا بُرا ہو۔ تم نے یہ بوجھ (خلافت) میری گردن میں ڈال دیا ہے اور اب اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو۔ بخدا میں تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔" پھر آپ نے انہیں حمص کا امیر (گورنر) مقرر کیا اور پوچھا! "تمہارے لئے روزی کا سامان کر دیا جائے۔

"امیر المومنین! میں اس کا کیا کروں گا؟ بیت المال سے ملنے والا وظیفہ بھی میری ضروریات سے زائد ہے۔" سعیدؓ نے کہا اور حمص چلے گئے۔

تھوڑی مدت بعد حمص سے ایک وفد حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے ان سے فرمایا! "مجھے اپنے محتاج اور غریب لوگوں کے نام لکھ دو تاکہ میں ان کی ضروریات پوری کروں۔"

حضرت عمرؓ نے ان کی تیار کردہ فہرست اٹھائی ایک دو ناموں کے بعد سعید بن عامر درج تھا۔ یہ "سعید بن عامر کون ہے؟" امیر المومنین نے پوچھا۔

"ہمارے امیر ہیں۔" اہل وفد نے جواب دیا۔

"کیا تمہارا امیر غریب ہے؟"

"جی ہاں۔ بخدا ان پر ایسے دن بھی آتے ہیں کہ ان کے گھر میں آگ تک نہیں جلتی۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے اور آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر آپ نے ایک ہزار دینار منگوا لئے اور فرمایا! "سعید کو میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ امیر المومنین نے یہ مال آپ کی ضروریات کے لئے بھیجا ہے۔"

وفد سعیدؓ کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تھیلی کھولی تو اس میں دینار پائے۔ جلدی سے تھیلی ایک طرف ڈال دی اور کہا! "اناللہ وانا الیہ راجعون" ..... گویا آپ پر بہت بڑی مصیبت نازل ہو گئی تھی..... ان کی اہلیہ یہ سن کر خوفزدہ ہو گئیں، لپک کر آئیں اور پوچھا!

"سعیدؓ! کیا ہوا؟..... کیا امیر المومنین وفات پا گئے؟"

"اس سے بھی بڑی مصیبت آ پڑی۔" سعیدؓ نے جواب دیا۔

"کیا مسلمانوں کو دشمن سے شکست ہوئی ہے؟۔"

"اس سے بھی بڑی مصیبت نے آلیا ہے۔"

"اس سے بھی بڑی کیا مصیبت ہے؟"

"دنیا، میری آخرت تباہ کرنے میرے پاس آگئی ہے اور فتنہ میرے گھر میں داخل ہو گیا ہے۔"

"اس سے نجات حاصل کر لیجئے۔" اہلیہ نے مشورہ دیا۔ انہیں خبر نہ تھی کہ اس سارے معاملے کا تعلق دیناروں سے ہے۔

"کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گی؟" سعیدؓ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

سعیدؓ نے دینار تھیلی میں ڈالے اور انہیں حاجت مند لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

اس واقعہ کو زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ حضرت عمرؓ حمص تشریف لائے اور یہاں کے لوگوں نے اپنے امیر کا شکوہ کیا اور اس سلسلے میں چار شکایات بیان کیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں! "میں نے سعید کو بلا بھیجا۔ مجھے ان پر بے حد بھروسا تھا۔ اس لئے میں نے دعا کی! اے اللہ! سعید کے بارے میں میرا گمان غلط نہ نکلے۔ سعید آ گئے تو میں نے لوگوں سے کہا! تمہیں اپنے امیر سے کیا شکایات ہیں؟"

"یہ اپنے گھر سے دن چڑھے تک نہیں نکلتے۔" اہل حمص نے پہلی شکایت بیان کی۔ میں نے سعید نے سے پوچھا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

سعید تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے! "بخدا میں یہ بات کہنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ میرے گھر والوں کے پاس کوئی خادم نہیں۔ میں ہر روز صبح اٹھتا ہوں اور ان کے لئے آٹا گوندھتا ہوں۔ پھر آٹے میں خمیر اٹھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے بعد ان کے لئے روٹی پکاتا ہوں۔ پھر نہا دھو کر لوگوں کے لئے باہر نکل آتا ہوں"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں! "میں نے حمص کے لوگوں سے پوچھا، تمہیں ان سے اور کیا شکایت ہے؟"

وہ بولے! "یہ رات کے وقت کسی کو جواب نہیں دیتے" میں نے کہا! "سعید اب آپ کیا کہتے ہیں؟"

سعید کہنے لگے! میں اس بات کا اعلان کرنا بھی ناپسند کرتا ہوں۔ دن میں نے لوگوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے اور رات اللہ تعالیٰ (کی عبادت) کے لئے۔"

میں نے لوگوں سے پوچھا! "تمہیں اور کیا شکایت ہے؟" وہ کہنے لگے! مہینے میں ایک دن یہ بالکل باہر نہیں نکلتے' میں نے سعید سے پوچھا! "اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

سعید نے کہا! "امیر المومنین! میرے پاس کوئی خادم نہیں اور نہ ان کپڑوں کے سوا، جو میں نے پہن رکھے ہیں، کوئی لباس ہے۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ انہیں دھوتا ہوں۔ پھر ان کے سوکھنے کا انتظار کرتا ہوں اور دن کے اختتام پر باہر نکلتا ہوں۔"

میں نے اہل حمص سے کہا! "تمہیں اور کیا شکایات ہے؟" وہ بولے! کبھی کبھار ان پر غشی کا دورہ پڑتا ہے اور انہیں اپنے آپ کی کچھ خبر نہیں رہتی" میں نے کہا! "سعیدؓ! یہ کیا معاملہ ہے؟"

سعید کہنے لگے! "میں نے خبیبؓ بن عدی کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ واقعہ مجھے آج بھی یاد آتا

ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں نے خبیبؓ کی مدد کیوں نہ کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا اور مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔"

یہ سن کر عمرؓ بولے! "الحمدللہ! سعید کے بارے میں میرا گمان درست نکلا" پھر آپ نے انہیں ضروریات کے لئے ایک ہزار دینار بھیجے۔ ان کی اہلیہ نے یہ رقم دیکھی تو کہا! "اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں آپ کی خدمت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ہمارے لئے کھانے پینے کا سامان خرید لائے اور ایک خادم معاوضے پر رکھ لیجئے۔"

"کیا تمہیں اس سے بہتر بات نہ بتاؤں۔" سعیدؓ نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟" اہلیہ نے پوچھا۔

"یہ دینار جہاں سے آئے ہیں وہیں لوٹا دیں۔ اس طرح ہم ایک اور ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔"

"وہ کونسی؟"

"ہم یہ رقم اللہ کو قرض حسنہ کے طور پر دے سکتے ہیں۔"

"ہاں..... اور اللہ ہمیں بہتر اجر دے گا۔" اہلیہ نے سعیدؓ کی تائید کی۔ چنانچہ سعیدؓ نے اپنے گھر کے ایک فرد کو کہا! "یہ دینار فلاں بیوہ، مسکین اور محتاج کو دے آؤ۔"

اللہ سعیدؓ بن عامر سے راضی ہوا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے..... "جو دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ خود تنگدست ہوتے ہیں۔"

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

انھیں نہ ماریئے

انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ہم بنے کمانڈو

منیر احمد راشد کے شگفتہ قلم سے فوجی تربیت کے چند ناقابلِ فراموش لمحے

اسے ہماری خوش قسمتی کہیئے یا بد نصیبی کہ بغیر کسی خواہش کے ہمارا انتخاب ایس ایس جی (اسپیشل سروسز گروپ) کے لئے ہوگیا اور ہمیں خوب مانجھ کر کمانڈو بنانے کی کوشش ہونے لگی۔ ابتدائی تربیت کے مرحلے سے گزر کر ہم اس قابل ہوئے کہ ہمیں پیراشوٹ کے ذریعے ہوائی جہاز سے چھلانگ لگانے کی ٹریننگ کے لئے جانا پڑا۔ پروگرام کے مطابق جہاز سے پہلے صوبہ سرحد میں واقع ایک بلند مینار سے جمپ لگانا تھا، تاکہ ہماری جھجک اور خوف کو کم اور حوصلے کو بلند کیا جاسکے۔ ہم اپنے گروپ کے ہمراہ اس جگہ پہنچے اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ جوان باری باری اس بلند مینار پر چڑھتے، اپنا نام، نمبر، رینک وغیرہ بتاتے اور اشارہ ملتے ہی چھلانگ لگادیتے۔ ہماری باری آئی تو ہم بھی خوش خوش اوپر پہنچے۔ یہاں صرف ایک کپتان جی موجود تھے جنہوں نے پیراشوٹ باندھنے میں ہماری مدد کی اور ضروری ہدایات کے علاوہ بلند حوصلگی کے لئے مختصر سا لیکچر بھی دیا۔ پیراشوٹ لاد کر ہم مینار کی کھڑکی تک آئے۔ اب جو نیچے جھانکا تو دل بہت ہی دور

دکھائی دی۔ پہلی مرتبہ زمین اور اس پر بسنے والوں کی پستی کا احساس ہوا...... نیچے بہت ہی نیچے کوئی ننھی منی مخلوق موجود تھی۔ کوئی چل پھر رہا تھا، کوئی بیٹھا آسمان کی طرف منہ کئے اچھے دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ہمیں اپنے بلند مرتبے کا احساس ہوا۔ اللہ نے ہمارا اقبال بلند کیا تھا! ہم خوش ہوئے اور کپکپاتی ٹانگوں سے پنجوں کے بل اٹھ کر ہم نے "خود ہی کو" تھوڑا اور بلند کیا اور مڑ کر کپتان صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے ہماری پیٹھ تھپکی۔ "شاباش جوان۔ جمپ ڈاؤن۔"

ان کی بات سُن کر ہم مسکرائے۔شریف آدمی ہمیں پستی کی طرف گرنے کو کہہ رہے تھے...... ان کی اس "شرافت" پر ہم نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا اور پلٹ کر دوبارہ نیچے دیکھا۔ وہاں بھی ہمارے بدخواہ ہاتھ سے اشارے کر کر کے ہمیں بلا رہے تھے۔ نجانے یہ پستی میں رہنے والے لوگ کسی کو ترقی کرتے کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ حسد کی آگ میں جلتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اوپر جانے والے کو بھی گھسیٹ کر اپنی سطح پر لے آئیں۔ مگر میں ان کی سطح پر آنا نہیں چاہتا۔

کپتان صاحب نے دوبارہ تھپکی دی اور کہا۔

"شاباش جوان۔ ڈرتے نہیں ہیں" گیٹ ڈاؤن (Gat Down)

وہ ہمیں بزدل سمجھ رہے تھے، ہمارے احساسات کو سمجھنے کے بجائے طعنے دے رہے تھے...... ہم نے ایک بار پھر انہیں دیکھا، وہ شفقت سے مسکرائے جیسے کڑوی دوائی پلانے سے پہلے بیمار بچے کی ماں اسے بہلانے کے لئے مسکراتی ہے۔ پھر ہم واپس پلٹے ہی تھے کہ ایک زبردست کک ہمارے پچھلے حصے پر پڑی اور ہم سیدھے ہوا میں تیرتے ہوئے نیچے کی جانب چلے۔

مینار سے نیچے آتے ہی ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے ہماری سانس رک گئی ہو۔ کلیجہ اچھل کر منہ کو آیا۔ حلق میں کوئی شے پھنس سی گئی، کان بند، آنکھیں بند، سانس بند...... ہم کسی پتھر کی مانند نیچے گر رہے تھے کہ اچانک ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کی دیوی نے بڑھ کر ہمیں تھام لیا ہو...... ایک عجیب سا سرور سارے بدن میں پھیل رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو پتہ چلا کہ ہمارا پیرا شوٹ کھل چکا ہے اور ہم بڑے سکون سے ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ ہوا میں اڑنے کا شوق تو ہمیں بچپن سے تھا لیکن کوئی یوں ہمیں ٹھوکروں میں اڑائے گا، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

خیر چند لمحوں بعد ہم زمین پر قدم رنجہ فرمانے والے تھے کہ آدم اور ابن آدم کو پناہ دینے والی یہی

زمین ہے۔ مگر اس دم تو لگتا تھا کہ یہ بھی ہم سے ناراض ہو گئی اور اس نے ہمارے قدموں کا رنج اٹھانے سے انکار کر دیا۔ البتہ یوں لگا کہ کسی زبردست قوت والے اسپرنگوں نے ہمیں دوبارہ ہوا میں اٹھالیا۔ بالآخر تھوڑی دیر بعد ہم اپنی اصلیت پر آ گئے۔ جونہی ہمارے پاؤں زمین پر پڑے۔ دماغ بھی درست ہو گیا۔ نیچے بیٹھے ہوئے سب فوجی اپنے اپنے سے لگے۔ آفیسر نے پاس بلایا اور پوچھا۔

"تم خود کودے تھے یا کدوایا گیا تھا؟" ہم حیران ہوئے کہ انہوں نے اتنی دور سے صحیح صورتحال کا اندازہ کیسے لگالیا۔ لیکن انہوں نے ہماری حیرت کو ایک طرف رکھتے ہوئے حکم صادر فرمایا کہ چلو دوبارہ جمپ لگاؤ۔

"ہائیں! دوبارہ جمپ" ہم نے خوف سے سوچا..... لیکن انکار کی گنجائش نہ تھی۔ فوراً مینار کے اوپر پہنچے اور سابقہ تجربے سے بچنے کے لئے اللہ کا نام لے کر آنکھیں بند کیں اور نیچے چھلانگ لگادی۔ مگر آفیسر کی آنکھوں میں شاید دوربین فٹ تھی۔ دوبارہ مجھے بلایا اور کہا۔

"آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگائی تھی ناں! چلو ایک بار پھر۔"

اب تو ہمارا خوف بھی خاصا کم ہو گیا تھا۔ فوراً اوپر پہنچے اور جوانمردوں کی طرح چھلانگ لگائی۔ آفیسر صاحب خوش ہوئے۔ پاس بلایا پیٹھ تھپکی اور بولے..... گیٹ آؤٹ (Get Out) تم کمانڈو بننے کے قابل نہیں ہو۔

آزادی سے پہلے کی بات ہے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نے ایک ہندوستانی بیرا ملازم رکھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ انگریزی زبان جانتا ہے۔ ایک دن صبح کو ڈپٹی کمشنر اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ بیرا اندر آیا اور ادب سے بولا "صاحب بلیک فیس لیڈی Black face lady صاحب سمجھے کہ کوئی کالے منہ کی عورت ان سے ملنے آئی ہے۔ باہر گئے تو کوئی بھی نہ تھا۔ واپس آکر پھر اخبار پڑھنے لگے۔ بیرے نے پھر کہا "صاحب بلیک فیس لیڈی" صاحب حیران پریشان ہو رہے تھے کہ اتنے میں میم صاحبہ آگئیں۔ صاحب نے ان سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

میم صاحبہ بولیں "یہ کہہ رہا ہے Break fast ready (ناشتہ تیار ہے)۔

غزل بانو..... رحیم یار خان

میری پہلی تحریر

آپ کچھ لکھنا چاہتے ہیں
آپ کی خواہش ہے کہ آپ کی کوئی تحریر شائع ہو
آپ مستقبل کے بڑے ادیب بننا چاہتے ہیں

تو پھر دیر کس بات کی

اپنی پہلی تحریر آج ہی ہمیں بھجوا دیجئے۔
آنکھ مچولی کے صفحات آپ کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے حاضر ہیں۔

خیال رہے

* _____ "میری پہلی تحریر" کے مستقل سلسلے میں صرف وہی قلمکار شریک ہو سکتے ہیں جن کی کوئی تحریر آج تک شائع نہ ہوئی ہو۔ (آنکھ مچولی یا کسی اور رسالے میں)
* _____ پہلی تحریر شائع ہو جانے کے بعد دوسری تحریر اس عنوان کے تحت شائع نہ ہو سکے گی۔
* _____ تحریر مختصر، صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک جانب لکھی گئی ہو۔ اپنی نگارش کے اختتام پر نام پتہ ضرور لکھیں۔
* _____ لکھنے کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں، بس اختصار اور دلچسپی شرط ہے۔
* _____ تحریر بھجوانے سے قبل کسی بڑے استاد یا بڑے لکھنے والے سے اصلاح لے لینا بہتر ہوگا
* _____ "میری پہلی تحریر" کا دلچسپ سلسلہ اکتوبر ۹۰ء سے شروع ہو رہا ہے۔ پہلی فرصت میں اپنی تحریر بھجوا دیجئے۔

"میری پہلی تحریر" ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۱۱ ڈی سائٹ کراچی

کتّوں کی دوستی

روسی ادب سے ماخوذ

پولکن نے یہ باربس سے کہا — حال لڑ لڑ کے ہوگیا ہے بُرا
بات بے بات ہم جھگڑتے ہیں — ساتھ رہتے ہیں اور لڑتے ہیں
آؤ دل سے نکال دیں نفرت — ہے نتیجہ لڑائی کا، خفت
باربس نے کہا حقیقت ہے — دوستی میں عجیب لذت ہے
آج سے ایک ساتھ کھائیں گے — دوستی کے مزے اڑائیں گے

دل سے کینہ نکال دو پیارے
غصہ آئے تو ٹال دو پیارے

دفعتً ایک گھر کے اندر سے — پھینکے باہر کسی نے کچھ ٹکڑے
دیکھ کر پولکن انہیں لپکا — اور تیزی سے باربس جھپٹا
پولکن دم اٹھا کے غرّایا — باربس دانت پیس کر آیا
ایک نے بڑھ کے منہ کو نوچ لیا — دوسرے نے اسے دبوچ لیا

چند ٹکڑوں پہ لڑ پڑے دونوں
حسب عادت جھگڑ پڑے دونوں

مرسلہ: محمد بن مالک

فطرت کی دنیا

کچھ باتیں حیوانوں کی

شین فاروقی

اگر آپ دیہات میں جائیں گے تو آپ کو وہاں مختلف اقسام کے پیڑ پودے نظر آئیں گے۔ لیکن وہاں پر آپ کو اتنی قسموں کے حیوانات نظر نہیں آئیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حیوانات کی اقسام پیڑ پودوں کی اقسام سے کم ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں پیڑ پودوں کی صرف پانچ لاکھ اقسام پائی جاتی ہیں جبکہ حیوانات کی تقریباً دس لاکھ اقسام زمین پر موجود ہیں اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جو انسان کے قریب آتے ہی دوڑ کر چھپ جاتے ہیں۔ پودے چونکہ دوڑ کر چھپ نہیں سکتے اس لئے وہ ہمیں سطح پر نظر آجاتے ہیں۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تعداد حیوانات کی تعداد سے زیادہ ہے۔

اکثر پودے بنیادی طور پر ایک جیسے لگتے ہیں۔ مثلاً سب کی ہری پتیاں ہوتی ہیں جن سے وہ اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس حیوانات، پودوں اور دوسرے حیوانات کو کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ حیوانات کے غذا حاصل کرنے کے بہت سے طریقوں کی طرح، حیوانات کے اندر اپنی جان بچانے کے بھی بہت سے طریقے پائے جاتے ہیں۔ ہر حیوان کا جسم ایک خاص طریقے سے بنا ہوتا ہے۔ جس کی بدولت وہ کسی خاص مقام سے غذا حاصل کرتا ہے۔ بھلا زرافے، باز، سانپ اور جیلی فش کے درمیان کیا بات مشترک ہے۔ ؟ لیکن اس کے باوجود یہ سب حیوانات ہیں۔ ان کے درمیان موجود فرق کی وجہ یہ ہے کہ یہ

مختلف مقامات پر رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف غذا کھاتے ہیں۔

ہم تمام حیوانات کو دو درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے حیوانات

(۲) ریڑھ کی ہڈی نہ رکھنے والے حیوانات

مچھلیوں، رینگنے والے حیوانات، چڑیوں، اور دودھ پینے والے حیوانات میں ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ تمام حیوانات ریڑھ کی ہڈی کے بغیر ہوتے ہیں۔

کچھ حیوانات گرم خون والے ہوتے ہیں۔ گرم خون والے حیوانات دراصل وہ حیوانات ہیں جن کے جسم کا درجۂ حرارت ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔ ان میں چڑیاں اور دودھ پینے والے حیوانات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ باقی حیوانات سرد خون والے حیوانات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حیوانات کے جسم کا درجۂ حرارت موسم کے تغیّر کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر وہ سرد جگہ پر ہونگے تو ان کے جسم کا درجۂ

حرارت کم ہوجائے گا اور اگر یہ گرم مقام پر ہونگے تو ان کے جسم کا درجۂ حرارت بڑھ جائے گا۔

ریڑھ کی ہڈی والے حیوانات کو دو چھوٹے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی

(۱) چھپکلیاں اور چڑیاں

(۲) دودھ پینے والے جانور

ہر حیوان ان دو گروہوں میں سے کسی ایک سے اس لئے تعلق رکھتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرح کے جسم کا مالک ہے۔ تاہم اس کے بیرونی جسم سے زیادہ اس کے جسم کی اندرونی ساخت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ حیوانات جو بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت مختلف ڈھانچہ رکھتے ہیں، مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً سانپ اور کیڑا یعنی کینچوا۔ اسی طرح کچھ حیوانات بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں لیکن ان کی جسمانی ساخت ایک جیسی ہوتی ہے۔ جیسے چمگادڑ انسان اور گائے۔ یہ تینوں دودھ پلانے والے حیوانات ہیں۔

حیوانات کی دنیا اکثر و بیشتر میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔ بہت سے حیوانات اپنی غذا کے لئے دوسرے حیوانات کو ہلاک کر دیتے ہیں جبکہ کچھ حیوانات دوسرے حیوانات سے اپنی جان بچاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم انسان کے سوائے شاید ہی کوئی حیوان اپنے جیسے جانور کو ہلاک کرتا ہو۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے کے کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن میں مختلف اقسام کے حیوانات ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر Oxpecker نام کے پرندے گائے اور بھینسوں وغیرہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ان حیوانات کی پوشیدہ جگہوں میں چمٹی ہوئی چیچڑوں وغیرہ کو نوچ کر نہ صرف یہ کہ اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنے دوستوں کے جسم کی صفائی کا سامان بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح خاص قسم کے کیکڑوں کا جسم بہت نازک ہوتا ہے، چنانچہ وہ اپنے جسم کو محفوظ کرنے کے لئے سمندری سیپیاں اوڑھ لیتے ہیں۔ بسا اوقات خاص سمندری پودے خود کو ان سیپیوں سے لپٹا لیتے ہیں۔ اس طرح وہ کیکڑے کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے بدلے میں انہیں کیکڑے کی جانب سے چھوڑی گئی غذا کھانے کو ملتی ہے۔ تاہم ایسی صورت میں صرف ایک آدھ جانور کو ایک آدھ جانور سے فائدہ ہوتا ہے۔ حیوانات میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن میں بہت سے حیوانات دوسرے حیوانات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً بہت سی ننھی مچھلیاں شارک مچھلیوں کے جھنڈ کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔ اس طرح انہیں نہ صرف یہ کہ مفت سفر کی سہولت میسّر آجاتی ہے بلکہ انہیں شارک مچھلیوں کی چھوڑی ہوئی غذا بھی بغیر کسی محنت کے حاصل ہوجاتی ہے۔

حادثے ایک دم بھی ہوتے ہیں

گولیاں اک دوسرے کی سمت میں بڑھتے ہوئے

منزل ہے کہاں میری؟

یہ کیا ہوا خدایا؟

کسے تھی خبر گولی چل جائے گی
کہانی حقیقت میں ڈھل جائے گی

خستہ کرارا ۔ نیا چٹخارہ
فریش ویل
بیسٹ نمکین
Freshwel
Best Namkeen
بیسٹ نمکین کی مکمل ورائٹی کراچی میں
فریش ویل کے تمام سیلز پوائنٹس پر دستیاب ہے
کراچی سے باہر رہنے والے اپنے دوست احباب سے فرمائش کریں

اچھی فلمیں وہی ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر محسوس ہو کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ سب کچھ سچ ہے۔ لیکن یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ فلموں میں دکھائے جانے والے سب مناظر جھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ جھوٹ سچ بن جاتا ہے۔ کیسے؟ آیئے ہم آپ کو سناتے ہیں۔

امریکی ٹی وی پر دکھائی جانے والی فلم Dynasty یعنی "سلسلہ سلاطین" کی ایک کہانی ریکارڈ ہو رہی تھی۔ منظر یہ تھا کہ کہانی کے دو کردار جیف کوبی اور بلیک اپنے گھر لوٹتے ہیں تو ان کا سامنا ایک بد عنوان پولیس افسر کیپٹن ہینڈلر سے ہوتا ہے جو بلیک کو کسی معاملے میں بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دونوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دونوں زخمی ہو جاتے ہیں۔ اس منظر کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان دونوں کرداروں کے ریوالوروں میں اصلی گولیاں ہوتی ہیں جس کے باعث وہ دونوں واقعتاً زخمی ہو جاتے ہیں۔

اس کہانی کے ایک اور منظر میں کہانی کے دو اور کردار ڈیکس اور آدم کے درمیان ہاتھا پائی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بال کنی تک آتے ہیں اور پھر آدم ڈیکس کو بال کنی کی ریلنگ کی طرف دھکا دے کر اسے نیچے گرا دیتا ہے۔ کہانی کے دو نسوانی کردار انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے دوڑتے ہیں مگر اس سے قبل ہی ڈیکس صاحب نیچے گر چکے ہوتے ہیں۔

ڈائی نیسٹی کے دونوں مناظر فلموں کی تاریخ کے دو انتہائی خوفناک واقعات ہیں۔ دونوں ریوالوروں میں گولیاں کہاں سے آئیں اور آدم نے ڈیکس کو جان بوجھ کر گرایا یا اتفاقاً ہی ایسا ہو گیا، اس کا جواب ابھی تک تلاش نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان دونوں خوفناک واقعات کو موقع پر موجود ایک فوٹو گرافر نے نہایت مہارت کے ساتھ محفوظ کر کے کروڑوں لوگوں تک پہنچا دیا۔ برابر کے صفحہ پر موجود تصاویر اس مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ فوٹو گرافر کی مہارت پر حیرت اور ان کرداروں کی قسمت پر افسوس کے ساتھ ملاحظہ کیجئے!

وضاحت

دل دل پاکستان میں کہانی "اللہ میاں سے ایک دُعا" جناب طارق محمود میاں کی تحریر کردہ تھی۔ کہانی پر غلطی سے ان کا پورا نام شائع نہ ہو سکا جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے

(ادارہ)

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارت صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔ قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

عثمان دقنہ

طاہر مسعود

جنھوں نے حکومت برطانیہ کی عظیم سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا

یہ کہانی مسلم ملک سوڈان کے ایک عظیم مجاہد کی ہے جن کا ذکر کتابوں میں بہت کم ملتا ہے۔ لیکن اس مجاہد کی شجاعت و بہادری کے قصے آج بھی سوڈان کی لوک کہانیوں اور گیتوں میں زندہ ہیں۔ اس مجاہد آزادی کا نام عثمان دقنہ تھا۔ اور یہ قصہ انیسویں صدی کے اس زمانے کا ہے جب دنیا کے ایک بڑے حصے پر سلطنت برطانیہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ برطانوی سلطنت اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اس پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ عثمان دقنہ نے اپنے چند مٹھی بھر ساتھیوں کی مدد سے اس عظیم سلطنت سے ٹکر لی

عثمان دقنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ

تھی۔ اس کی یہ ٹکر اتنی زبردست تھی کہ برطانوی حکومت ہل کر رہ گئی تھی۔ عثمان دقنہ کو شکست دینے اور اسے گرفتار کرنے کے لئے برطانوی فوج کے نامور جرنیلوں کو سوڈان بھیجا گیا، لیکن ان میں سے چند ایک تو مارے گئے اور چند ایک بری طرح زخمی ہو گئے۔ عثمان دقنہ تو ایک چھلاوہ تھا، بجلی کی ایک کڑک تھی جو اچانک فرنگی فوج پر ٹوٹ پڑتی اور اس کی صفوں کو تہس نہس کر دیتی تھی۔ مگر ذرا ٹھہریئے۔ اس افسانوی کردار کے بارے میں ہم آپ کو شروع سے بتاتے ہیں۔

عثمان دقنہ مشرقی سوڈان کے شہر سواکن سے تعلق رکھتے تھے۔ سواکن کی اہمیت ان دنوں اس لئے بہت زیادہ تھی کہ وہاں سوڈان کی سب سے اہم بندر گاہ تھی۔ ساحل سمندر کے ساتھ ایستادہ پہاڑوں میں بے خوف اور بہادر قبائل آباد تھے۔ یہ قبائل آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ان کی دشمنیاں نسلوں تک چلتی تھیں۔ برطانیہ پر ان دنوں ساری دنیا پر حکومت کا جنون سوار تھا۔ وہ ان قبائل کو بھی فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ عثمان دقنہ سواکن کے معروف دقنائی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے خاندان کے افراد تجارت کیا کرتے تھے۔ عثمان دقنہ بھی ان کے ساتھ تجارت میں شامل ہو گئے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے صرف ان کی نہیں بلکہ قبیلوں کی زندگیوں کا رخ بدل دیا۔ ہوا یوں کہ ایک برطانوی جہاز نے عثمان دقنہ کے بھائی کے جہاز کو اپنے قبضے میں کر لیا، ان کے گودام کو بھی لوٹ لیا اور سارے خاندان کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار ہونے والوں میں عثمان دقنہ بھی شامل تھے۔ رہا ہونے کے بعد عثمان دقنہ کو گزر اوقات کے لئے روٹی کے ایک کارخانے میں ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ لیکن اب ان کے ذہن میں بار بار ایک ہی خیال پیدا ہو رہا تھا کہ بڑھتی ہوئی فرنگی قوت کی اگر روک تھام نہ کی گئی تو ایک دن ان کا ملک غلام ہو جائے گا۔ عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ان کی نگاہیں سمندر کے ان راستوں کی طرف تھیں جہاں فرنگی با آسانی قابض ہو کر ان کے ملک کے لئے مسائل پیدا کر سکتے تھے۔

عثمان دقنہ نے بہت غور و خوض کے بعد سواکن کی اہم کاروباری شخصیتوں کا ایک اجلاس بلایا اور انہیں اس خطرے سے آگاہ کیا۔ ان کاروباری لوگوں نے سمجھا کہ عثمان دقنہ کے خاندان کو برطانوی جہاز کے ہاتھوں جو نقصان پہنچا ہے، وہ اس کا انتقام لینا چاہ رہا ہے۔ اسی لئے انھوں نے عثمان دقنہ کی باتوں پر توجہ نہ دی اور انہیں ایک خطرناک آدمی قرار دے کر سواکن سے نکال باہر کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ عثمان دقنہ کو اس کی خبر مل گئی اور وہ سواکن سے نکل کر ایک دوسرے شہر بربر میں جا کے آباد ہو گئے۔

عثمان دقنہ نے ہمت نہ ہاری اور برطانیہ کے خلاف قبائل کے لوگوں کو ہموار کرتے رہے۔ یہاں

سواکن اور اس کے ارد گرد کا علاقہ

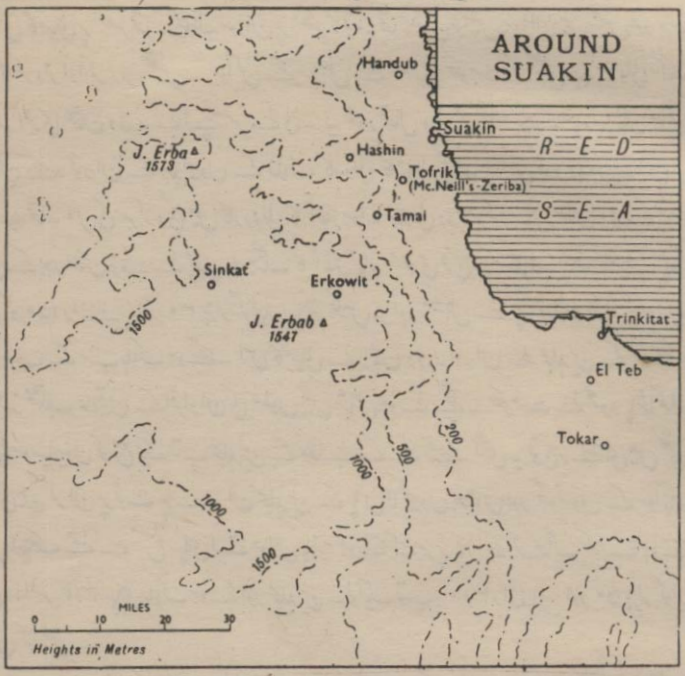

تک کہ وہ وقت آگیا جب انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ تحریک جہاد کا آغاز کیا۔ وہ اور ان کے ساتھیوں نے قرآن پر حلف لیا کہ وہ فرنگیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے ایک مضبوط دیوار بن جائیں گے جیئیں گے تو آزادی کے ساتھ، ورنہ شہادت کی نعمت تو مل ہی جائے گی۔ جب وہ یہ عہد کر رہے تھے تو ان کے پاس عزم و حوصلے کے سوا کچھ بھی تو نہ تھا۔ ہاں مگر ایک چیز تو ان کے پاس تھی۔ خدا کی مدد..... جس پر انہیں پورا پورا یقین تھا۔ اس زمانے میں سوڈان میں ایک تحریک جہاد پہلے ہی شروع کی جا چکی تھی جس کے رہنما مہدی سوڈانی تھے۔ عثمان دقنہ کا ان سے رابطہ ہوا تو انھوں نے عثمان دقنہ کو سواکن علاقے کا امیر مقرر کر دیا۔ اب عثمان دقنہ نے لوگوں کو اس جہاد میں شامل ہونے پر ابھارنا شروع کیا۔ ان کی پرکشش شخصیت اور بے پناہ جوش و جذبے سے متاثر ہو کر لوگ جوق در جوق ان کے حلقے میں آتے گئے۔ اور یوں مجاہدین کا ایک جتھا فرنگیوں کے خلاف جہاد کے لئے تیار ہو گیا۔

جہاد کے اس مرحلے میں مہدی سوڈانی اور عثمان دقنہ کا خیال تھا کہ سواکن کے راستے مصری

حکومت کو جو امداد بھیجی جاتی ہے سب سے پہلے اس امداد کا راستہ بند کیا جائے۔ کیونکہ آئندہ فتوحات کا سارا انحصار اسی کامیابی پر منحصر تھا۔ کیونکہ سوڈان پر مصر کا قبضہ تھا مصری فوجیں سوڈان میں تھیں اور برطانیہ کی پٹھو فوج کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ سواکن کے ساحل سے مصری حکومت کو بھیجی جانے والی کمک کو روکنے کی ذمہ داری عثمان دقنہ نے اپنے سر لے لی۔ یہ صورتحال دیکھ کر حکومت خاصی پریشان ہوئی اور اس نے عثمان دقنہ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کاروائی کا فیصلہ کیا۔ سواکن اور دوسرے قصبوں کا گورنر توفیق بے تھا۔ اس کی سرکردگی میں کارروائی کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دو معرکوں میں عثمان دقنہ کو شکست ہوئی۔ جس کے بعد عثمان دقنہ نے چھاپہ مار جنگ کا آغاز کیا۔ مصری فوج کے خلاف پہلے کامیاب چھاپے میں مجاہدین کو ۱۵۰ رائفلیں اور ۳۰ ہزار گولیاں ہاتھ لگیں۔ اور مشکل سے چھ سات افراد جان بچا کر بھاگے، باقی سب کے سب ہلاک ہوگئے۔ اس کامیابی نے عثمان دقنہ اور ان کے مجاہدین کے حوصلے بلند کر دیئے۔ اور مختلف علاقوں کے افراد ان کی صفوں میں شامل ہونے لگے۔ حکومت نے محمود پاشا کمال کی کمان میں پانچ سو سپاہیوں کو مع ایک توپ مجاہدین کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ ابھی یہ فوج رستے ہی میں تھی کہ مجاہدین قہر الٰہی بن کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان مجاہدین کے پاس لاٹھیوں بھالوں اور گھونسوں کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن اس اچانک حملے سے مسلح سپاہی اتنے حواس باختہ ہوئے کہ سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس حملے میں ۱۱ افسر ۴۱۲ سپاہی ہلاک ہوئے اور مجاہدین نے ایک توپ، ۳۰۰ رائفلیں اور ۵۰ ہزار گولیاں اپنے قبضے میں کر لیں۔

حکومت برطانیہ جس کی مفتوحہ سلطنتوں میں اس وقت بیس کروڑ مسلمان آباد تھے۔ ان مٹھی بھر جانبازوں کی فتوحات سے سخت ہراساں ہوئی۔ یوں بھی مصری حکومت اپنی آقا حکومت برطانیہ کو ایک تار کے ذریعہ مطلع کر چکی تھی کہ سوڈان کی حالت تشویش ناک ہوتی جا رہی ہے اور اب وہ اس کا کنٹرول نہیں سنبھال سکتی۔ لہٰذا برطانوی حکومت امداد کے لئے اپنی فوجیں روانہ کرے۔ برطانوی حکومت کو اب سوڈان سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ کہیں خود مصر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد برطانوی حکومت نے اپنی فوج کے ایک مشہور سپہ سالار جنرل گارڈن کو مصر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل گارڈن مصر سے سوڈان کے لئے روانہ ہوا تاکہ مجاہدین کی قوت کو کچل سکے۔ لیکن ایک سال کے اندر اندر مجاہدین نے جنرل گارڈن کو بھی اپنے ایک حملے میں ہلاک کر دیا۔ مہدی سوڈانی اور ان کے نائب عثمان دقنہ کی قیادت میں مجاہدین کی کامیابیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور انگریزی فوج سخت نقصان اٹھا چکی تھی۔ انگریزوں کا طریقہ کار ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جب وہ میدان میں ہار جاتے ہیں تو پھر مکر و فریب کی چالوں پر آجاتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں اسی طرح ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کو شکست دی تھی۔ سوڈان میں بھی انھوں نے یہی

طریقہ اختیار کیا۔ اور مختلف عرب شیوخ سے عثمان دقنہ کو خطوط لکھوانے شروع کئے کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ لیکن عثمان دقنہ ان حربوں میں آنے والے نہ تھے۔ انھوں نے اپنے ایک جوابی خط میں انگریز افسر ایڈمرل ہیوٹ کو لکھا:

"یہ بات جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے مہدی سوڈانی کو بھیج دیا ہے تاکہ اللہ کا دین سربلند ہو جو لوگ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں وہ سرخرو ہوں اور جو اس کا انکار کرتے ہیں انہیں ختم کر دیا جائے..... آپ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کریں، ورنہ ہمارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔"

جنرل گارڈن کی موت سے حکومت برطانیہ پہلے ہی سراسیمہ تھی۔ ملکہ برطانیہ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئیں۔ برطانوی اخبارات جنرل گارڈن کے لمبے چوڑے قصیدے چھاپ رہے تھے۔ لہٰذا فرنگی حکومت نے انتقام لینے، عثمان دقنہ کو قتل کرنے کے لئے ایک بڑی فوج مشرقی سوڈان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنرل گراہم کی سرکردگی میں بھاری تعداد میں برطانوی فوج اسلحے خانے کے ساتھ سواکن پہنچی۔ عثمان دقنہ دس ہزار مجاہدین کے ہمراہ اس مقابلے کے لئے تیار تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے مقابلے کے لئے گوریلا جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین رات گئے انگریز کے کیمپوں پر چھاپے مارتے اور انہیں قتل کر دیتے۔ ان اچانک حملوں سے انگریز فوجی اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ راتوں کو اپنے بستروں پر آرام کی نیند سونا ان کے لئے حرام ہو گیا۔ عثمان دقنہ اور ان کے مجاہدوں نے اس گوریلا طریق جنگ میں ۱۴۸ برطانوی افسروں اور جوانوں کو مار ڈالا۔ اور یوں حکومت برطانیہ کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا اور اسے مجبوراً اپنی فوج واپس بلانا پڑی۔ ساحل سواکن پر عثمان دقنہ کی قیادت میں مہدی سوڈانی کا فاتحانہ پرچم لہرا رہا تھا۔ برطانوی حکومت کی اس مہم پر ۷ کروڑ روپئے خرچ ہو چکے تھے اور سوائے ہزیمت کے ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا۔

مئی ۱۸۸۵ء میں اب ایک نئے سپہ سالار جنرل ہڈسن کو سواکن کے محاصرے کی کمان دی گئی۔ بد قسمتی سے اسی سال جدوجہد آزادی کے عظیم قائد مہدی سوڈانی کا انتقال ہو گیا۔ جس سے اس تحریک کو عظیم نقصان پہنچا..... لیکن انگریزوں کے دانت کھٹے کرنے کے لئے عثمان دقنہ ابھی زندہ تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے حوصلے بڑھائے۔ اور جلدی ہی ان کی قیادت میں پورے سوڈان پر مجاہدین نے اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ عثمان دقنہ نے اپنے آزاد کرائے ہوئے علاقوں میں شرعی قوانین نافذ کر دئے اور اپنی زبردست انتظامی صلاحیتوں سے لوگوں کی معاشی حالت بہتر بنانی شروع کی۔

دوسری طرف برطانوی حکومت نے عثمان دقنہ کے مقابلے کے لئے اپنے ایک بہترین فوجی دماغ کو

سواکن شہر کا ایک دلکش نظارہ

بھیجا جس کا نام برطانیہ کی دفاعی تاریخ میں آج بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ جنرل کچنر تھا۔ جنرل کچنر نے نہایت عیاری سے یہ فیصلہ کیا کہ عثمان دقنہ سے براہ راست فوجی ٹکر نہ لی جائے بلکہ مقامی آبادی سے مل کر انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس منصوبے کے تحت جنرل کچنر نے ایک پیادہ سپاہیوں کی ایک ٹیم مقامی افراد کے ہمراہ ان خیموں کی طرف بھیجی جہاں عثمان دقنہ مجاہدین کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ مجاہدین پر حملہ اچانک ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کہ حملہ آور عثمان دقنہ کو گرفتار کرتے وہ بجلی کی سی تیزی سے ایک اونٹ پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔ مجاہدین نے جوابی حملہ کیا جس سے کچنر کے ساتھیوں کے قدم اکھڑ گئے۔ خود کچنر کے جبڑے پر گولی لگی اور وہ شدید زخمی ہو گیا۔

عثمان دقنہ کا نام برطانوی حکومت کے لئے دہشت کی علامت بن چکا تھا۔ مصری فوجیوں کی حالت تو یہ ہو گئی تھی کہ عثمان دقنہ کا نام سنتے ہی دم دبا کر میدان سے بھاگ لیتے تھے۔ مجاہدین کامیابیاں تو حاصل کر رہے تھے لیکن مقابلے پر ایک وسیع و عریض سلطنت تھی جو کئی براعظموں کی سیاہ و سفید کی مالک

تھی..... اس سے ہمیشہ جنگ کرتے رہنا آسان نہ تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ یہ عیار طاقت اب کھلی جنگ کے بجائے سازشوں اور جوڑ توڑ پر اتر آئی تھی۔ عثمان دقنہ اور ان کے مجاہدین کے خلاف انگریزوں نے سازشیں شروع کیں اور مقامی آبادی کو خریدنے لگے۔ انہیں بھاری معاوضے کی لالچ دے کر عثمان دقنہ کے خلاف کام کرنے پر اکسایا جانے لگا۔ ادھر چند ایک معرکوں میں مجاہدین کو شکستیں بھی ہوئیں۔ ان شکستوں سے وہ قبائل ہمت ہار بیٹھے جو اب تک عثمان دقنہ کی کامیابیوں کی وجہ سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسری طرف انگریزی فوج کا دباؤ بڑھتا جارہا تھا اور انھوں نے عثمان دقنہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ عثمان دقنہ کو محسوس ہو چکا تھا کہ جدوجہد آزادی کا یہ کھیل اب ختم ہونے والا ہے۔ لہٰذا وہ دریائے نیل عبور کر کے پہاڑوں میں مقیم ایک قبیلے کے سردار شیخ محمد علی کے پاس پہنچے۔ یہ قبیلہ انگریزوں کے خلاف متعدد جنگوں میں لڑ چکا تھا۔ عثمان دقنہ نے شیخ محمد علی سے کہا کہ وہ ان کے لئے ایک کشتی کا انتظام کر دیں تاکہ وہ جدّہ پہنچ کر باقی زندگی عبادت و ریاضت میں گزار دیں۔

شیخ محمد علی نے ان سے وعدہ کر لیا..... اور ان کے ہمراہ ایک نوکر اور ایک کتا کر دیا۔ کتے کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دشمن کی بو پاکر بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔ حقیقتاً شیخ محمد علی انگریزوں کے ہاتھوں بک چکا تھا۔ اس نے نوکر کو ہدایت کر دی کہ اگر کتا بھونکے تو عثمان دقنہ کو بتا دے کہ بھیڑ بکریوں کی وجہ سے کتا بھونک رہا ہے۔ اس انتظام کے بعد شیخ محمد علی نے اپنے بھتیجے کو سواکن بھیج کر انگریزوں کو عثمان دقنہ کے بارے میں مطلع کر دیا۔ انگریزوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۰۰ء کو کیپٹن برجس کی سرکردگی میں ایک پولیس پارٹی عثمان دقنہ کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دی۔ پولیس پارٹی بخار کے قریب پہنچی تو کتے نے بھونکنا شروع کر دیا۔ عثمان دقنہ نے نوکر سے پوچھا: "کتا کیوں بھونک رہا ہے؟"

نوکر نے جواب دیا: "کچھ عرب اپنے گلّے سمیت گزر رہے ہیں، کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

عثمان دقنہ یہ سن کر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس پارٹی غار کے دہانے پر پہنچ گئی۔ عثمان دقنہ کو اندازہ ہو گیا کہ دشمن سر پر آپہنچا ہے انھوں نے غار کے عقبی حصے کی جانب چھلانگ لگائی اور اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے نکل جاتے لیکن پولیس نے دوسری جانب بھی گھیرا ڈال رکھا تھا۔ انہیں فوراً ہی گھیر لیا گیا اور اس شاہین صفت مجاہد کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

کیپٹن برجس کو اور محمد بے جو گرفتار کرنے آئے تھے انھوں نے عثمان دقنہ کی صرف شہرت سنی تھی، دیکھا نہ تھا۔ انہیں پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ عثمان دقنہ کو گرفتار کر چکے ہیں۔ البتہ محمد بے کو عثمان دقنہ کی کچھ نشانیاں معلوم تھیں اور وہ یہ کہ جس شخص کے سر پر تلوار کا زخم، بائیں کلائی پر گولی کے زخم اور پشت پر سنگین کے زخم کے نشانات ہوں تو وہ یقیناً عثمان دقنہ ہی ہوں گے۔ تحقیق کی گئی تو نشانیاں

موجود تھیں۔

عثمان دقنہ کو گرفتار رکھا گیا۔ غالباً انہیں حکومت برطانیہ نے پھانسی کی سزا اس لئے نہیں دی کہ اس طرح وہ سوڈان میں جدو جہد آزادی کی علامت بن جاتے۔ بغاوت ہو جاتی اور لوگ اٹھ کھڑے ہوتے۔ عثمان دقنہ کو ۱۹۴۴ء میں حج پر جانے کی اجازت مل گئی اور یوں ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

آج بھی جب سوڈان کے اُن راستوں پر جہاں غدار شیخ محمد علی کا قبیلہ آباد تھا۔ اونٹوں پر سوار گزرتے ہوئے شتربان اس جانب اشارے کرتے ہوئے مقامی گیت گاتے ہیں:

ندو امر عثمان ابکا

ری روب دیا با

اور ریبیای حصای مساور

مغمن اور بای حروطط

(لوگوں نے سردار عثمانؒ کو چند سکّوں کے عوض حکومت کے ہاتھوں بیچ دیا۔ میرے بیٹے حصامی، اس کو پہاڑوں میں ڈھونڈنے کے لئے یوں نہ نکلو)

(اس مضمون کی تیاری میں محمد حامد کی کتاب "عثمان دقنہ، عالم اسلام کا عظیم مجاہد" سے مدد لی گئی)

شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے

جنگِ ستمبر

دُنیا نے کیا دیکھا ؟

مُرسلہ :۔ علی فرہاد حمید

۶ ستمبر کو ہم ان پاکستانی مجاہدوں کی یاد مناتے ہیں جنھوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مادر وطن کا دفاع کرتے ہوئے بہادری کے نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔ ہماری بہادر فوج نے نہایت کٹھن حالات میں دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایسے دشمن کا جسے افرادی قوت اور جنگی ساز و سامان کی برتری حاصل تھی۔

بھارتی فوج نے چوروں کی طرح اچانک پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ لیکن پاکستانی فوج نے اس بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ اسے کسی پاکستانی علاقے پر قبضے کا موقع نہ مل سکا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کا بھارتی خواب کرچی کرچی ہو گیا۔ بھارت نے پاکستانی علاقوں پر قبضہ کرنے کے پاگل پن میں نہ صرف اپنے علاقے

کھو دیئے بلکہ اس کی فوجی قوت بھی تباہ ہو گئی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق بھارت کے کم از کم پانچ سو ٹینک تباہ یا ناکارہ ہوئے۔ بھارتی فضایہ اپنے ڈھائی سو طیاروں سے محروم ہو گئی جبکہ توپوں گاڑیوں اور دیگر سامان کے نقصانات کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ صرف چھمب کے محاذ پر بھارت اپنا ایک پوار کا پوار توپ خانہ چھوڑ کر بھاگا اور اس کاروائی میں مرنے والے سپاہیوں کی تعداد سات ہزار کے قریب تھی۔ جبکہ پاک فضایہ کے صرف ۲۷ ہوائی جہاز ۱۶۵ ٹینک اور تقریباً دو ہزار کے قریب فوجی جوان و افسر شہید ہوئے۔

بھارت کے کل مرنے والے فوجیوں کی تعداد کم از کم ۲۵ ہزار تھی۔ پاکستانی بحریہ کی واحد آبدوز نے دشمن کے دو جنگی جہاز ڈبو دیئے اور اس کا ایک بحری اڈہ اور ریڈار اسٹیشن دوار کا بھی تباہ کر دیا۔ اس جنگ کے بارے میں عالمی رائے عامہ کا اندازہ غیر ملکی اخبارات کی رپورٹوں سے لگایا جاسکتا ہے؛ جو ان دنوں شائع ہوئیں۔ مشہور کمین ٹیٹر چارلس ڈگلس ہوم نے جنگ ستمبر کے بارے میں کہا کہ سپاہی کا سپاہی سے مقابلہ ہو یا ایک یونٹ کا دوسری یونٹ سے، پاکستانی فوج کا معیار بھارتی فوج سے کہیں بلند ہے۔ کئی محاذوں پر شدید ترین جنگ جاری ہے۔ بھارت نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی مزید کمک بھیج دی ہے لیکن وہ پاکستانی پوزیشنوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ اگرچہ بھارتی نقصانات کے اعداد و شمار ظاہر نہیں ہوئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ گزشتہ ہفتے اسے بھاری نقصانات اٹھانا پڑے ہیں۔ اخبار آگے چل کر لکھتا ہے کہ بھارت کثیر تعداد میں ٹینک طیارے اور دوسرا فوجی سازوسامان گنوا بیٹھا ہے۔ بھارت پاکستان کی قوت اور عالمی رائے عامہ سے بوکھلا اٹھا ہے۔ اور لاہور میں گھس بیٹھنے کا بھارتی خواب چکنا چور ہو گیا اور اب پاکستانی کی چھوٹی سی فوج مکمل مستعدی سے بھارتی سرزمین پر لاہور سے بھی ۵۰ میل آگے دو محاذوں پر لڑ رہی ہے۔

لندن کے اخبار آبزرور نے میدان جنگ سے اپنے فوٹوگرافر سٹیوارٹ ڈنجر کی کھینچی ہوئی دو تصاویر شائع کیں جن کے ساتھ اخبار نے سرخی دی کہ بھارتی حکومت نے اپنی طرف کے محاذوں پر کسی فوٹوگرافر کو آنے کی اجازت نہیں دی جس کا مطلب ہے کہ صورت حال پاکستان کے حق میں ہے۔

ٹائم میگزین نے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے کہا کہ پاکستانی فوجیوں سے مقابلہ کرنے والی بھارتی فوج کی کوئی بھی رجمنٹ جم کر مقابلہ نہ کر سکی۔ کئی مقامات پر بھارتی فوج توپ خانہ، جنگی سازوسامان سپلائز اور دیگر سامان کے کپڑے تک چھوڑ کر بھاگ گئی۔

ٹاپ آف نیوز واشنگٹن نے لکھا کہ بھارت ایک فیصلہ کن کاروائی کے لئے بھاری جمعیت کے ساتھ آیا تھا لیکن پاکستان کی فوج اس کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی اور دشمن کو بھاری جانی و مالی نقصان

پہنچایا۔ بھارت کا پاکستان پر حملہ کھلی جارحیت تھی جس کی ساری دنیا نے مذمت کی۔ خود ہندوستان کے ایک اخبار ہندوستان ٹائمز نے اعتراف کیا کہ کسی بھی ایک ملک نے حتیٰ کہ مصر اور یوگوسلاویہ تک نے بھارت کی حمایت کا اعلان نہیں کیا۔ "اس زمانے میں مصر اور یوگوسلاویہ بھارت کے زبردست حلیف تھے۔"

ایک بھارتی لیڈر باج پائی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ کسی بھی حکومت نے بھارت کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔ کسی ایک بھی افریقی یا ایشیائی قوم نے بھارت کی حمایت کا ذرہ برابر بھی اشارہ نہیں کیا۔ یہ انٹرویو ایک اور بھارتی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں ۱۳ ستمبر کو شائع ہوا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان اب تک کئی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ان کی وجوہات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ کہ جب بھی کشمیری حریت پسندوں نے آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی تو بھارت نے پاکستان پر جنگ مسلط کر دی تاکہ مسئلۂ کشمیر جوں کا توں رہے۔ اب پھر کشمیری حریت پسندوں نے آزادی کی جدوجہد شروع کی ہے۔ اور بھارت ایک طرف تو پاکستان کو جنگ کی دھمکیاں دے رہا ہے اور دوسری طرف سندھ میں ہنگاموں کو ہوا دے رہا ہے۔ تاکہ سندھ میں بھی بنگلہ دیش والے حالات پیدا کر کے اسے بھی پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے آپ کو سندھی، پٹھان، بلوچی اور پنجابی کی بجائے صرف اور صرف پاکستانی سمجھیں۔ پاکستان کشمیر کے مسئلے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ بھارت کشمیریوں پر کتنا بھی ظلم و ستم کرے آخر کار "کشمیر بنے گا پاکستان" کا نعرہ ضرور سچ ثابت ہو گا

گول نہیں چوکور

چکر باز آئینہ

اُس آئینے کا قصہ جس نے پوری بستی کو پریشان کر کے رکھ دیا

احمد آفتاب

پیارے دوستو! یہ قصہ اس وقت کا ہے جب بنگال مہذب اور ترقی یافتہ دنیا سے دور ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں سیدھے سادے لوگ رہتے تھے۔ جن کا سب سے پہلا کام کھیتوں میں ہل چلانا تھا تو سب سے آخری کام چارپائی پر لمبی تان کر سونا۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور لوگ کیسی کیسی چیزیں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ لوگ برسوں سے ایک ہی طرح کی زندگی گزارتے چلے آ رہے تھے اور صرف وہی باتیں جانتے تھے جو بزرگوں نے انہیں بتائیں تھی۔

اسی بے خبری کے دور میں کابل کا ایک مشہور تاجر، اپنے قیمتی سامان سے لدے قافلے کے ساتھ بنگال کے ایک چاول کے کھیت میں سے گزرا۔ سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے تاجر کو پتا نہیں چلا اور اس کے اونٹوں پر رکھے صندوقچوں میں سے ایک چھوٹا سا، نفیس اور منقش آئینہ نکل کر زمین پر گر پڑا۔ تاجر کا قافلہ آگے بڑھ گیا اور شیشہ دھوپ میں چمکتا رہا۔

اگلی صبح کھیت کے مالک، بھولے بھالے کسان نے کسی چیز کو زمین پر چمکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اب سے پہلے کبھی آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آئینے کو اٹھایا اور اس میں جھانکا۔ وہاں کسی انسان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کسان نے چند لمحے کے لئے سوچا اور پھر خوشی سے جھوم اٹھا۔

"ابا" اس نے بے ساختہ نعرہ لگایا۔ "مجھے پتا تھا تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گے۔ مرنے کے بعد تم آسمانوں سے زمین پر مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہو۔ تمہیں مجھ سے بہت محبت جو تھی۔ اور اب تم یہاں چھپے ہوئے تھے۔ اس کے باپ کو مرے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا اور عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ خود اس کی شکل بھی اپنے باپ جیسی ہی ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب اس نے آئینے میں اپنے باپ کے جیسی صورت کو پایا تو اس کا معصوم ذہن یہی اندازہ لگا پایا کہ شاید اس کا باپ مرنے کے بعد دوبارہ ملنے کے لئے زمین پر آیا

ہے۔ اور اب اسے ہر چیز اپنے باپ کو دکھانی چاہئے۔

"یہ دیکھو ابا" چلتے چلتے اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ ہمارا کھیت ہے۔ اس پر میں نے ہی چاول بویا تھا۔ اب فصل تیار ہونے ہی والی ہے۔ اور..... یہ میری بھینس ہے۔ بہت دودھ دیتی ہے۔ اور یہ بھی..... نہیں نہیں تمہاری بہو ہے۔ بہت موٹی ہوگئی ہے نا بالکل بھینس جیسی..... اور....." کسان آئینہ چہرے کے سامنے کئے بولتا گیا اور یوں اس نے سارے گاؤں کا چکر لگایا۔ شام ڈھلے وہ گھر واپس آیا اور شیشہ کو حفاظت سے پانی کے ایک مرتبان میں رکھ دیا۔ غریب ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کوئی صندق موجود نہیں تھا۔

اگلے دن کسان نے صبح اٹھ کر شیشے میں جھانکا، اسے سلام کیا اور پھر کھیت کو روانہ ہوگیا۔ سارا دن کام کرنے کے بعد وہ شام ڈھلے جلدی جلدی گھر واپس آیا اور آتے ہی شیشے کو سامنے رکھ کر باتیں شروع کریں۔ اس کے پاس کرنے کو بہت ساری باتیں تھی۔ بہت سارے قصے تھے جو وہ اپنے باپ کو سنانا چاہتا تھا۔ وہ رات گئے تک بولتا رہا اور دھیمی آواز میں شیشے سے باتیں کرتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ اس کا معمول بن گیا۔ سارا دن کھیتوں میں کام کرنے کے بعد وہ شیشہ لے کر بیٹھ جاتا اور باتیں شروع کر دیتا۔ لیکن اب تو اس نے کئی دنوں سے بیوی سے بات بھی نہیں کی تھی۔ بیوی نے سوچا۔ "ہو نہ ہو۔ ضرور اس برتن میں کچھ ہے۔ جب ہی میرا میاں مجھ سے بات نہیں کرتا۔ مجھے معلوم کرنا چاہئے۔"

ایک دن کسان کے کھیت کو چلے جانے کے بعد اس نے برتن اٹھایا اور شیشہ نکال کر اس میں دیکھا۔ وہاں اسے کسی عورت کی شکل نظر آئی۔ اس نے اب سے پہلے کبھی شیشہ نہیں دیکھا تھا۔ نا ہی اسے اپنی شکل کی پہچان تھی۔ عورت کی شکل دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اب پتا لگا نا کہ میرا میاں۔ بھوں بھوں۔ مجھے سے بات کیوں نہیں کرتا۔ بھوں، اس نے دوسری عورت سے شادی جو کر لی ہے۔ بھوں بھوں۔ اور اسے برتن میں رکھا ہے اور چھپ چھپ کر باتیں کرتا ہے۔ آج آنے دو اسے میں اسے اچھی سکھاؤں گی۔ بھوں۔ ں ں ں"

بیوی نے اپنے ہاتھ میں جھاڑو اٹھائی اور کسان کا انتظار کرنے لگی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کے غصے میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر شام ہوئی اور کسان تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ مگر گھستے ہی اس کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ سامنے ہی اس کی بیوی جھاڑو سے سر پر دوسرا وار کرنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔

"دھوکے باز..... جنگلی، الو، پاگل" بیوی چلا کر بولی، "تو نے دوسری عورت سے شادی کر لی؟ بتا۔ کون ہے یہ؟ اس نے شیشہ کسان کی طرف اچھالا۔ کسان نے اسے ہوا میں ہی پکڑ لیا۔

"ارے۔ یہ کیا کر رہی ہو! یہ تو میرا باپ ہے۔ میرے باپ کو ہوا میں اچھال رہی ہو" اس نے شیشے کو سینے سے لگا لیا۔

"اچھا" ..... بیوی نے آگے بڑھ کر شیشہ چھین لیا۔ "اب میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ ذرا بتاؤ۔ کیا یہ عورت تمہارا باپ ہے" اس نے شیشہ کسان کے سامنے کیا۔ "کیا تمہارا باپ کانوں میں بندے پہنتا تھا! اس کی چٹیا بھی تھی"

"کیا کہہ رہی ہو۔" کسان سٹپٹا گیا اور شیشے میں دیکھا۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میرے باپ کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ یہ دیکھو" اس نے شیشہ دوبارہ بیوی کو دیا۔ جسے دوبارہ آئینہ میں اپنی سوتن کی شکل دکھائی دی۔ وہ چیخ پکار کرنے لگی۔ ان دونوں کے درمیان ہنگامہ اتنا بڑھا کہ ان کا ایک پڑوسی صورتحال معلوم کرنے کے لئے آ گیا۔

"یہ دیکھو بھائی" بیوی نے آنسو پونچھ کر شیشہ پڑوسی کو پکڑایا۔ "انہوں نے دوسری عورت سے شادی کر لی ہے۔ اور اسے پانی کے برتن میں چھپا رکھا تھا۔ روز ساری رات اس سے ہی باتیں کرتے رہتے تھے، مجھے بھول گئے تھے۔ میں تو اس کا سر توڑ دوں گی۔"

پڑوسی نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ مگر شیشے میں اسے دو چہرے نظر آئے۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو بھابی؟ یہاں تو دو شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک تو تمہاری ہے۔ دوسری کسی اور آدمی کی ہے۔ کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے"

"کیا بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو" کسان بولا "یہ تو میرا باپ ہے۔ اس میں ایک عورت اور ایک مرد کی شکل کہاں آ گئی؟" اس نے آگے بڑھ کر دیکھا لیکن چکرا گیا۔ وہاں اس کے باپ کی شکل تو موجود تھی لیکن ساتھ ہی پڑوسی اور بیوی کی شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اس مرتبہ ان تینوں کے درمیان تکرار شروع ہو گئی۔ یہاں تک سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا لوگ آتے گئے اور شیشے میں دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتے گئے ان میں سے ہر ایک کو شیشے میں اپنی ہی شکل دکھائی دی اور یوں ہر شخص اپنی ہی بولی بول رہا تھا۔

کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ آخر کار بڑی بحثوں اور دلیلوں کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ وہ چیز کچھ اور نہیں سوائے شیشے کے۔ جس میں سامنے والی شے کا عکس نظر آتا ہے۔ پھر جیسے ہی ان کی شیشے کی اچھوتی خصوصیت کا پتا چلا۔ چاروں طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ لوگ دور دور سے شیشے کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔

کہتے ہیں اس کے بعد کسان نے شیشے کو دیکھنے پر ٹکٹ لگا دیا تھا۔ اور پیسوں سے بھینس بیچ کر گائے خرید لی تھی۔ اب اسے اطمینان تھا کہ باپ کبھی آسمانوں سے زمین پر آیا ..... تو اپنی بہو کو آسانی سے پہچان لے گا۔

ڈنڈا ڈولی

ان صفحات میں ہم ہر ماہ کسی ایک موضوع کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کرتے ہیں
اکتوبر کے لئے موضوع ہے "ڈاکٹر" جبکہ نومبر کا موضوع ہوگا "وکیل"

انعامی لطیفہ

"بیٹا جلدی اٹھو اسکول کا وقت ہو گیا ہے تمہیں اسکول جانا ہے۔" ماں نے اپنے بیٹے کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"امی میں اسکول نہیں جاؤں گا، مجھے اسکول سے نفرت ہے مجھے بچے بھی پسند نہیں کرتے، استاد مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اسکول کا سارا اسٹاف مجھے ناپسند کرتا ہے۔"

"مگر تمہیں اسکول جانا ہو گا" ماں بولی۔

"تم اب بچے نہیں ہو، ۵۰ سال کے آدمی ہو اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو۔"

محمد انعام..... کراچی

ایک بچے کا اسکول میں پہلا دن تھا۔ واپسی پر اس کے باپ نے پوچھا:

باپ۔ "اسکول میں کیسے رہے؟"

بیٹا۔ "سب سے اونچا۔"

باپ۔ (حیرانی سے) "وہ کیسے؟"

بیٹا۔ "سارا دن ڈیسک پہ کھڑا رہا۔"

قرۃ العین شارق..... کراچی

خبردار جو نقل کی

بچوں کو "سُستی" پر مضمون لکھنے کو دیا گیا۔
دوسرے دن کاپیاں چیک کرتے وقت ایک کاپی ایسی بھی آئی جس میں پورا صفحہ خالی تھا اور آخری سطر پر درج تھا۔ "جناب یہ ہے سستی۔"

کاشف عزیز...... کراچی

امتحان ہال میں ایک طالب علم کو پریشان دیکھ کر استاد نے پوچھا: "کیا سوال بہت مشکل ہے؟" "جی نہیں" لڑکے نے کہا۔
"تو پھر چپ چاپ کیوں بیٹھے ہو؟" استاد نے پوچھا؟
لڑکا بولا: "سوچ رہا ہوں کہ اس سوال کا جواب میری کون سی جیب میں ہے؟"

مقصود علی...... حیدر آباد

ایک ٹیچر نے پہلی جماعت کی ایک بچی سے پوچھا:
"بتاؤ ٹیچرز اسکول کیوں آتی ہیں؟"
بچی: (جلدی سے بولی) "اپنے بچوں کے سوئیٹرز تیار کرنے......!"

ثمرین ظفر...... کراچی

استاد نے دیر سے آنے والے ایک طالب علم سے کہا۔
"دیکھو تمہیں معلوم ہے کہ اسکول نو بجے لگ جاتا ہے"
طالب علم "یس مس! وقت کی پابندی بہت ضروری ہے چنانچہ میں آؤں یا نہ آؤں آپ اسکول شروع کر دیا کریں۔"

مرسلہ: نیلم عباسی...... کراچی

بلاعنوان

استاد نے جماعت کے لائق ترین بچے کو سمجھایا کہ کل جب آفیسر اسکول کا معائنہ کرنے آئے تو وہ پوچھے گا کہ آپ کو کس نے پیدا کیا؟ تو تم جواب دینا "اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔" جب آفیسر اسکول کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے لڑکوں سے پوچھا کہ "آپ کو کس نے پیدا کیا ہے؟" لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ جب دو تین بار پوچھنے پر کوئی جواب نہ ملا تو ایک لڑکا اٹھ کر بولا۔ "جناب جس لڑکے کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے وہ آج اسکول نہیں آیا۔"

غلام عباس طاہر...... شور کوٹ

شاہد (عامر سے) "تمہارا انگلش کا پرچہ کیسا ہوا۔"
عامر: "بہت گندا ہوا۔"
شاہد: "کیوں؟"

عامر: "میری یادداشت کم زور ہوگئی ہے۔"

شاہد: "کیا یاد کئے ہوئے سوال بھول گئے تھے؟"

عامر: "نہیں دراصل جو سوال میں نے کل فوٹو اسٹیٹ کرائے تھے وہ اپنے ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔"

سید تسنیم حسن

ایک لڑکا بھیک مانگ رہا تھا کہ ایک عورت نے ہمدردی سے کہا، "تم جیسے بچوں کو تو اسکول میں جانا چاہئے۔"

اس لڑکے نے اداس ہو کر کہا، "اسکول میں بھی گیا تھا مگر دو تین روپے کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔"

جاوید بربرہ..... علی پور

اسکول کا ایک بچہ جب تقریر کر کے واپس آیا تو اپنے دوست سے کہنے لگا، "جتنے تقریر سن رہے تھے سب گدھے تھے۔"

دوست نے جواب دیا "جبھی تم انہیں میرے بھائیو میرے بھائیو کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔"

خواجہ عمر فاروق..... کراچی

ماسکو کے ایک پرائمری اسکول میں استاد نے شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں جو روس میں پیدا ہوئے۔

ہمارے یہاں ہر خاندان کے لئے نفیس ترین اپارٹمنٹس مفت ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خوراک اور بچوں کے لئے جدید ترین اسکول اور کھلونے فراہم ہیں۔ روس کسی جنت سے کم نہیں۔"

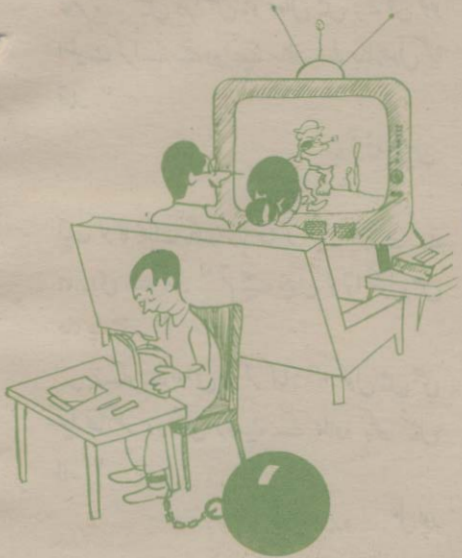

یہ سن کر ایک شاگرد کھڑا ہوا اور بولا۔
"سر میں بھی روس جاکر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔"

شاگرد (استاد سے) "جو کام میں نے نہیں کیا ہو اس کی سزا مجھے نہیں ملنی چاہئے نا؟"
استاد: "بالکل نہیں۔"
شاگرد: "سر میں نے آج ہوم ورک نہیں کیا۔"

تاریخ کا استاد...... (رشید سے) "اس نقشے میں یورپ کہاں ہے؟"
رشید...... (انگلی رکھ کر) "یہ ہے جناب۔"
استاد...... "اچھا حمید اب تم بتاؤ کہ یورپ کو کس نے دریافت کیا؟"
حمید...... "رشید نے جناب۔"
ظفر اقبال...... سمہ سٹہ

یہ ہے۔ بچوں کو پڑھانے کا
صحیح طریقہ

MASS

بلّے باز

پروفیسر عنایت علی خان

جب پڑھائی کرتے کرتے بور ہو جاتا ہوں میں
داب کر بلاّ بغل میں فیلڈ پر آتا ہوں میں
پھر نہیں رہتا مجھے دنیا کے دھندوں کا خیال
صبح ہو یا شام ہو بس کھیلتا جاتا ہوں میں
ڈیڈ پِچ ہو اور سلو بالر تو میرے عیش ہیں
فاسٹ پِچ اور فاسٹ بالر ہو تو گھبراتا ہوں میں
ان کٹر، آؤٹ کٹر سے ہو کے بالکل بے نیاز
بند کر کے آنکھ بس بلاّ گھما جاتا ہوں میں
میں تو چوکا مارتا ہوں اور ہو جاتا ہے کیچ
اپنی ماجد خانیت، پر جھینپ سا جاتا ہوں میں
فارورڈ جاتا ہوں یا گگلی اٹھانے کے لئے
عقب میں اپنے مگر وکٹیں گری پاتا ہوں میں
اپنی نادانی سے گو ہوتا ہوں میں آؤٹ مگر
لیگ امپائر کو لیکن گھورتا جاتا ہوں میں
سنچری کا گرچہ لے کر دل میں جاتا ہوں خیال
لے کے اک انڈا مگر واپس پلٹ آتا ہوں میں
ہو کے اب محتاط میں کھیلوں گا اگلے میچ میں
ہر دفعہ یہ کہہ کے اپنے دل کو سمجھاتا ہوں میں

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دھی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

* ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
* ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
* ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔
* ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
* ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

جہانِ نو

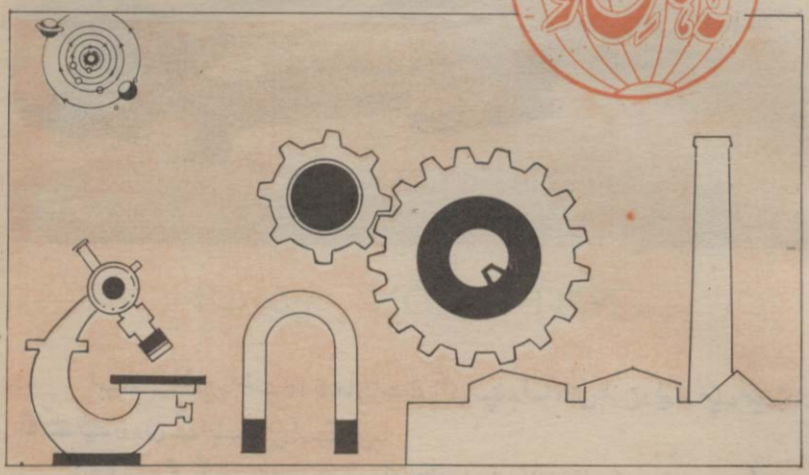

محمد صالح ارشاد

مستقبل کے ٹائر

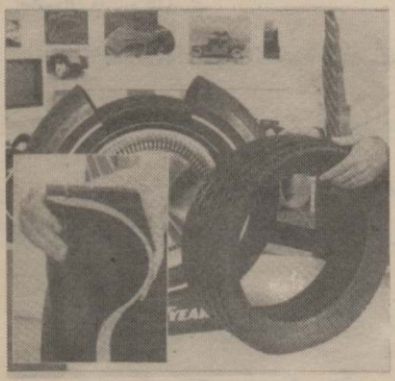

مریض کی جان خطرے میں ہے، ایمبولنس تیز رفتاری سے بھاگی جارہی ہے۔ پنکچر ہوتا ہے اور ٹائر کی ہوا نکل جاتی ہے۔ لیجئے مریض اپنی جان سے گیا۔

اس کا حل GOODYEAR والے مستقبل کے ٹائر سے پیش کرتے ہیں۔

دو ٹائروں پر مبنی ایک ٹائر بنایا گیا ہے۔ باہر کے ٹائر کی ہوا نکل جانے کی صورت میں اندر موجود ٹائر خود بخود پھول کر ٹائر کی جگہ لے کر گاڑی کو رواں دواں رکھتے ہیں۔

اسے امریکہ کی کمپنی GOODYEAR نے بنایا ہے۔

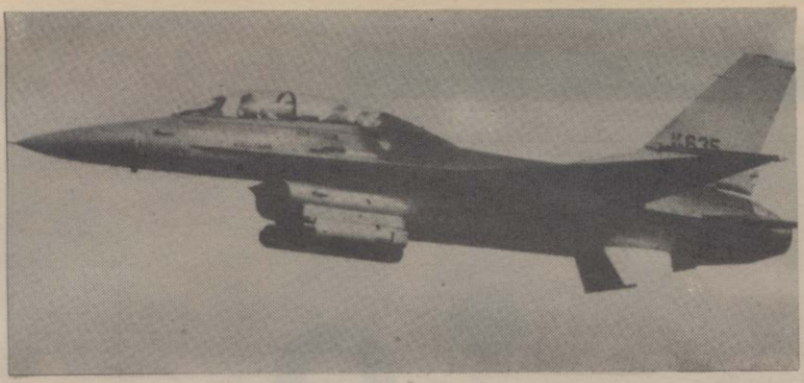

NITE VISION نائٹ ویژن

اب ہمارے شاہین صفت F 16 جہاز رات میں بھی اپنے ہدف کو اس طرح دیکھ کر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگا سکتے جیسے وہ دن کے اجالے میں کرتے ہیں۔

جہاز کے نیچے لگے ہوئے ڈبوں میں سے ایک انفرا ریڈ سینسر ہے جو پائلٹ کو اس کا ہدف **دن کی طرح** صاف اور واضح دکھاتا ہے

جب کے دوسرا ڈبہ جہاز سے فائر کئے گئے میزائل کو نشانے پر گرنے میں مدد دیتا ہے۔

گھڑیوں کے جیولز

آپ نے اکثر گھڑیوں کے اندر جیولز کی تعداد لکھی دیکھی ہوگی جو اس طرح لکھی ہوتی ہے، 17 JEWELS یا 21 JEWELS یہ جیولز کیا ہیں اور کس کام آتے ہیں۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

جیولز کسی بھی گھڑی کے معیار کو متعین کرتے ہیں۔ جتنے زیادہ جیولز ہوں گے اتنی ہی گھڑی اچھی ہوگی۔

ایک عام گھڑی کے اندر اوسطاً ۲۱۱ مختلف پرزے ہوتے ہیں جس کے سبب گھڑی کا نظام کافی پیچیدہ ہوتا ہے۔ چابی والی گھڑیاں ایک مین سپرنگ MAIN SPRING کی مدد سے چلتی ہیں۔ جب گھڑی میں چابی بھری جاتی ہے تو سپرنگ ٹائٹ ہو جاتا ہے۔ یہ سپرنگ گھڑی میں موجود مختلف اقسام کے پہیوں کو حرکت دیتا ہے۔ اور گھڑی کے ڈائل پر موجود سوئی حرکت کرنے لگ جاتی ہے۔ آج کل سیل سے چلنے والی گھڑی میں سپرنگ کے بجائے ایک مقناطیسی کوائل لگا ہوتا ہے جو سیل سے توانائی لے کر پہیوں کو حرکت

دیتا ہے۔

مسلسل حرکت کرتے ہوئے پہیئے ایک PIVOT پر رکے ہوتے ہیں۔ پہیوں کی مسلسل گردش سے رگڑ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے گھڑی کے پرزوں کو نقصان پہنچا ہے اور وقت بھی آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔ اس رگڑ سے محفوظ رہنے کے لئے پہیوں کے نیچے قیمتی پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے جاتے ہیں۔

JET BIKE جیٹ موٹر سائیکل

یہ موٹر سائیکل صرف دیکھنے میں ہی دیو ہیکل نہیں بلکہ بھاگنے میں بھی بہت تیز ہے۔ اس کا ۱۳۵۰ ہارس پاور کا طاقتور انجن کوئی عام انجن نہیں بلکہ جیٹ انجن ہے۔ یہ موٹر سائیکل ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیز رفتاری سے بھاگ سکتی ہے۔

اس میں موجود جنرل الیکٹرک کا تیار کردہ T 58 انجن اکثر ہیلی کاپٹروں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اسے AERO VISIONS (14962 MERCED CIRCLE IRVINE, CA-LIF92714) نے بنایا ہے۔

بمپر بریکس

دیو ہیکل ٹرک پیچھے کی جانب ہٹتے ہوئے ایک صاحب کو ٹکر مارتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان صاحب کو چوٹ نہیں آتی ہے۔

چوٹ نہ آنے کا سبب ٹرک کے پیچھے کی جانب لگے ہوئے فوم کے نرم بمپر ہیں۔ اس بمپر میں ایسے حساس آلات لگے ہوئے ہیں جو کسی بھی شے سے مس کرتے ہی ٹرک کے بریک کو حرکت میں لے آتے ہیں اور ٹرک انسان یا گاڑی کی ہلکی سی ٹکر مارتے ہی فوراً رک جاتا ہے۔ اسے AVON BACK STOP DIV. ENGLAND نے بنایا ہے۔

ٹماٹر پھل یا سبزی؟

آج سے ۱۰۰ سال قبل یہ سوال کافی متنازعہ تھا، کہ ٹماٹر پھل ہے یا سبزی، کچھ لوگ اسے پھل کہتے تھے اور کچھ اسے سبزی سمجھتے تھے۔

اس تنازعے کے سلسلے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کو حل کرنے کے لئے بات سپریم کورٹ تک جا پہنچی اور وہیں اس بات کا فیصلہ ہوا۔

ماہر نباتیات کے مطابق ٹماٹر ایک پھل ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ایک مسئلہ یہ ہے کہ ٹماٹر، سوپ، کیچپ، سالن اور دوسرے دیگر کھانوں میں ڈالا جاتا ہے۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے امریکہ کی سپریم کوٹ میں ۱۸۹۳ء میں ٹماٹر کو سبزی قرار دے دیا۔

ٹماٹر پہلے پہل شمالی امریکہ میں واقع پیرو، ایکاڈور، اور بولیویا کے مقامات پر پایا جاتا تھا۔

ٹماٹر کو یورپ میں سب سے پہلا نام ۱۵۵۹ میں اٹلی میں ملا، جہاں اسے POMPID'ORO یا "سنہرا سیب" کہا گیا۔

امریکہ میں سب سے پہلے ٹماٹر اگانے والا شخص THOMASJAFFERSON تھا جس نے ۱۷۸۷ میں اسے اگایا۔

آلو اور تمباکو کے پودے کی طرح ٹماٹر کے پودے کو بھی اچھی کھاد، مناسب روشنی اور وافر مقدار میں پانی درکار ہوتا ہے۔

ستمبر کے گمنام ہیرو

۸، ۹ ستمبر کی درمیانی رات کا پچھلا پہر تھا سپاہی فیض احمد اور اس کے ساتھی آہستہ آہستہ دشمن کی ایک چوکی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کی حفاظت کے لئے مشین گن کی ایک پوری کمپنی مامور تھی۔ خاموشی سے رینگتے ہوئے مجاہدین مورچوں کے قریب پہنچ گئے اور پوری قوت سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ کائنات لرز اٹھی۔ دشمن کے ہتھیاروں کے منہ کھل گئے مگر بوکھلاہٹ میں اکثر ہتھیاروں کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ جلد ہی دو مورچوں کا صفایا کر دیا گیا مگر تیسرا مورچہ بلندی پر تھا اور برابر آگ اگل رہا تھا۔ سپاہی فیض احمد نے اپنے ساتھیوں کو سست پڑتے دیکھا تو فوراً اپنا راکٹ لانچر تیار کیا اور بولا جونہی میں گولہ فائر کروں تم آگے بڑھ کر مورچے پر ٹوٹ پڑنا اس نے نشانہ لے کر گولہ فائر کیا جو عین نشانے پر لگا سپاہی فیض احمد اٹھا اور نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا..... نعرہ تکبیر اللہ اکبر..... مگر ابھی بمشکل دو گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ایک گولی عین چھاتی میں لگی سینے کے زخم کو ٹٹولا۔ لانچر نیچے گر پڑا اس کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور سینہ چھلنی ہو گیا پلاٹون کمانڈر رینگتے ہوئے قریب پہنچا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ کمانڈر نے غور سے سنا تو وہ کہہ رہا تھا! "صوبیدار صاحب دیکھ لیں گولی میرے سینے میں لگی ہے پشت پر نہیں۔ قیامت کے دن گواہ رہئے گا۔ خدا آپ کو فتح نصیب کرے۔ خدا حافظ۔"

مرسلہ غلام عباس طاہر

۶ ملکوں کے نام بنائیے

F	H	C	Y	L	A
R	I	C	E	I	T
N	A	N	E	R	M
A	A	G	S	S	A
M	E	A	I	U	N
R	I	C	A	R	Y

"ا" کو پہلے حرف کے طور سے لیجئے پھر ملے ہوئے خانے کا حرف چن کر کسی بھی سمت چل دیجئے...
دائیں بائیں اوپر نیچے یا آڑے ترچھے کی کوئی قید نہیں

ایک خط

☆

عمران مشتاق

پیارے سعید!

تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر میں بہت حیران ہوا۔ یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ تمہارا خط مجھ تک نہ پہنچ سکے گا اور اگر پہنچا بھی تو میں جواب نہ دوں گا۔ دیکھ لو تمہارا خط مجھ تک پہنچا بھی اور میرا جواب تو تم پڑھ ہی رہے ہو۔ میں اس ملک کے ہر شہری سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنا کہ کوئی اپنی ذات سے کر سکتا ہے۔ اور اپنی ذات تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔ تمہارا خیال بالکل غلط ہے کہ میرے پاس بچوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری مصروفیات بہت ہوتی ہیں۔ مگر بیٹا ایک بات جان رکھو کہ تم بھی میری مصروفیت میں شامل ہو۔ صرف تم ہی نہیں اس ملک کا ہر بچہ۔ مجھے امید ہے تمہاری یہ غلط فہمی تو دور ہو گئی ہوگی کہ میرے پاس تم لوگوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ اب میں تمہارے خط کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ بیٹا مجھے خط کا یہ حصہ پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ مجھے افسوس ہوا کہ تم اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہو۔ تم چھوٹے بچے نہیں ہو۔ چھٹی جماعت میں پڑھتے ہو۔ بیٹے اپنے والدین کے بارے میں کبھی بھی بُرے انداز میں نہ سوچنا۔ والدین کبھی بھی اپنے بچوں کے لئے بُرا

نہیں سوچ سکتے۔ تمہیں ان سے یہ شکایت ہے کہ وہ تمہیں بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں، تم سے پیار بالکل نہیں کرتے، دن رات ڈانٹتے ہی رہتے ہیں، جبکہ تمہارے دوسرے بھائیوں کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اور تمہارے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ نہ تو تم اپنے بہن بھائیوں کی طرح خوبصورت ہو اور نہ ہی لائق اس لئے تم اپنے والدین کے عتاب کا نشانہ بنتے ہو۔ بیٹا تمہاری سوچ صحیح نہیں ہے۔ تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ اگر تمہارا رنگ کالا ہے، تمہارا قد عمر کے اعتبار سے کافی چھوٹا ہے اور تمہارا کوبڑ بھی نکلا ہے تو پھر کیا ہوا۔ یہ سب باتیں ایسی تو نہیں کہ تم احساس کمتری کا شکار ہو جاؤ۔ اصل چیز انسان کی محنت ہے جو اسے چھوٹا یا بڑا بناتی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا رنگ، قد اور کوبڑ کبھی بھی تمہاری ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے اگر تم سخت محنت کرنے کا عزم کر لو۔ انسان کا مضبوط ارادہ اسے کامیابی کے دروازے تک لے جاتا ہے اور محنت اس دروازے کی کنجی ہے۔ اور کنجی تمہارے پاس موجود ہے۔

تمہیں اپنے والدین سے شکوہ ہے کہ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ سخت ناراض ہوتے ہیں اور پٹائی بھی کر دیتے ہیں۔ بیٹا کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم سے ہمیشہ ہی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں۔ تم سے گھر کے برتن کیوں ٹوٹتے ہیں؟ تم کوئی بھی کام توجہ سے کیوں نہیں کر پاتے؟ پڑھائی میں تمہارا دل نہیں لگتا۔ تم کبھی بھی اچھے نمبروں سے پاس نہیں ہوئے۔ تم نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی تعریف کی جائے۔ ان سب باتوں کا صرف ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ تم محنت سے جی چراتے ہو اور ہر کام لاپرواہی سے کرتے ہو۔ جب تم اپنی ان کمزوریوں پہ قابو پالو گے تو پھر دیکھنا تمہیں کبھی کوئی نہیں ڈانٹے گا۔ اور اگر انسان غلطی کرے تو اسے سرزنش تو کی ہی جاتی ہے۔ اس بات کا کبھی بھی بُرا نہیں ماننا چاہئے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ سرزنش کیوں کی گئی اور آئندہ اس بات سے بچنا چاہئے۔ مجھے امید ہے تم نے میری ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہو گا تو پھر آج مجھ سے وعدہ کرو کہ خوب محنت سے تعلیم حاصل کرو گے ہر کام توجہ سے کرو گے اور کبھی بھی اپنے والدین کو شکایت کا موقع نہ دو گے۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار رہے گا لیکن بہتر ہو گا اگر تم مجھے کچھ عرصے کے بعد خط لکھو۔ تمہاری طرح اور بھی تو بہت سارے لوگ مجھے خط لکھتے ہیں ناں! انہیں بھی تو جواب دینا ہوتا ہے۔ اگر جواب نہ دو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ناراض نہ ہو گے۔ تو پھر آج سے ہی محنت شروع کر دو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وحید صاحب کے کانپتے ہاتھوں سے خط نیچے گر گیا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ خط خود صدر مملکت نے ان کے بیٹے سعید کے نام لکھا ہے۔ خط کے نیچے کئے گئے دستخط اور صدر مملکت کی مہر کی موجودگی اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ یہ خط صدر صاحب ہی کی جانب سے ہے۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ خط انہیں نہیں پڑھنا چاہئے تھا۔ ہر شریف آدمی کی طرح کسی دوسرے کے خط کو پڑھنا وہ بھی معیوب سمجھتے

انہیں نہیں پڑھنا چاہئے تھا۔ ہر شریف آدمی کی طرح کسی دوسرے کے خط کو پڑھنا وہ بھی معیوب سمجھتے تھے۔ لیکن اس خط کو انہوں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھولا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سعید کو بھی کوئی خط لکھ سکتا ہے اور ایسا سوچنے میں وہ حق بجانب بھی تھے۔ کیونکہ سعید کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی وہ بہت چپ چاپ رہنے والا بچہ تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہ تھی۔ وہ خود سے کبھی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہر دم گم صم رہتا تھا۔ سعید کے دل میں چھپے ہوئے طوفانوں سے تو وہ آج واقف ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان سب کا رویہ سعید سے واقعی کچھ بہتر نہ تھا۔ کچھ کمزوریوں کے باعث اس کی شخصیت کچھ دب سی گئی تھی۔ اسے بھی عام بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کیا جاتا تھا۔ جبکہ اسے دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ کی ضرورت تھی تاکہ اس کی شخصیت بھی ابھر کر سامنے آسکے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب سعید پر زیادہ توجہ دیں گے۔

انہوں نے گوند سے لفافے کو دوبارہ بند کر کے سعید کی میز پہ رکھ دیا۔ انہیں یقین تھا کہ سعید کو اس بات کا پتہ نہیں چل سکے گا کہ خط کو کھولا گیا ہے۔ شام کے وقت جب سعید اپنے کمرے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ کسی انجانی خوشی سے دمک رہا تھا۔ مسرت اس سے چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ "اس کا مطلب ہے سعید نے خط کو پڑھ لیا ہے۔" وحید صاحب نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ دیکھ رہے تھے کہ سعید میں کافی تبدیلیاں آتی جارہی ہیں۔ اب وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ پہلے وہ اپنے بہن بھائیوں سے کٹا کٹا رہتا تھا اب وہ ان کے ساتھ کھیل میں بھی شریک ہونے لگا تھا۔ گھر کے سبھی افراد اس سے اب بہتر طریقے سے پیش آنے لگے تھے۔ اب اسے احساس ہوا کہ شاید غلطی اس کی اپنی تھی۔ ورنہ اس سے سب ہی پیار کرتے تھے۔ پھر سالانہ امتحانات کا وقت قریب آگیا۔ امتحانات ہوئے اور ختم بھی ہوگئے۔ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح وہ بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا۔ اسے پاس ہونے پر گھر کے ہر فرد نے تحفہ دیا تھا۔ اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اب اس کا اعتماد بحال ہوگیا تھا۔ جس دن اس کا رزلٹ نکلا اسی رات وہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

ڈیر صدر انکل!

"آپ کا خط ملے ہوئے تو کئی مہینے ہوچکے ہیں۔ لیکن آپ کے حکم کے مطابق میں نے آپ کو جواب نہیں دیا تھا۔ آج میں آپ کو جواب دے رہا ہوں اس خوشخبری کے ساتھ کہ میں چھٹی جماعت میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا ہوں۔ صدر انکل آپ بالکل ٹھیک کہتے تھے غلطی میری اپنی تھی۔ میں خود ہی کوئی کام ٹھیک طریقے سے نہیں کرتا تھا۔ میرے سارے گھر والے مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں خود ہی ان

سے دور دور رہتا تھا۔ لیکن اب مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ مجھے اپنی ذات پہ کوئی شرمندگی نہیں۔ نہ تو میں اب اپنے کالے رنگ اور چھوٹے قد کی پرواہ کرتا ہوں اور نہ ہی کوبڑپن کی۔ میں اب سخت محنت کرنے لگا ہوں۔ میں ضرور محنت کر کے بڑا آدمی بنوں گا۔ آپ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ صدر انکل آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ میں آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔"

فقط

مخلص

محمد سعید

سعید کا یہ خط بھی اس کے ابّو نے چوری چھپے پڑھ لیا۔ انہیں اس بات کا احساس تو تھا کہ انہیں یہ بُری حرکت نہیں کرنی چاہئے لیکن پھر صرف یہ سوچ کر انہوں نے ایسا کیا کہ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سعید کے اپنے الفاظ میں اس کے اندر کس حد تک تبدیلی آئی ہے۔

جب ڈاکئے کے آنے کا وقت ہوتا تو سعید بار بار داخلی دروازے کی جانب دیکھنے لگتا۔ اس کی یہ بے چینی وحید صاحب سے چھپی ہوئی نہیں تھی وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتے۔

ایک دن اخبار پڑھتے ہوئے ایک چھوٹی سی خبر دیکھ کر وحید صاحب چونک اٹھے۔ "صدر مملکت کی ڈاک کی چیکنگ پہ متعین افسر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے صدر مملکت کی پرسنل سیکریٹری کے میز کی دراز سے صدر مملکت کی مہر نکالتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا گیا۔ حیرت انگیز انکشافات کی توقع کی جارہی ہے۔" گھنٹی کی آواز سن کر وحید صاحب نے اخبار سے سر اوپر اٹھایا۔ سعید دروازے کی جانب دوڑا جارہا تھا۔ "شاید ڈاکیا ہو۔" وحید صاحب نے سوچا۔ "اب سعید کو صدر مملکت کی جانب سے کوئی خط نہیں آئے گا۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

ہیچی کو

جاپان کا مشہور ترین مجسمہ ہیچی کو، ٹوکیو میں نصب ہے۔ ہیچی کو دراصل جاپان کا ایک نسلی کتا تھا۔ اس کا مالک ٹوکیو یونیورسٹی میں استاد تھا۔ ہچی کو اسے لینے کے لئے روزانہ اسٹیشن جاتا تھا۔ اپنے مالک کے انتقال کے بعد بھی ہیچی کو دس سال تک ہر روز اسٹیشن جاتا رہا اور آخر ایک دن اسی جگہ مر گیا جہاں اس نے اپنے مالک کو آخری بار دیکھا تھا۔

میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا؟

ہجرت کے دل گداز مناظر کی کہانی متین الرحمٰن مرتضیٰ کے قلم سے

قسط نمبر ۲

جب پاکستان بنا تو میں سات برس کا تھا۔ ہمارا گھر پٹیالہ کے تاریخی مقام بھٹنڈہ میں تھا۔ ہمارے ابو علاقے کے سینیٹری آفیسر تھے۔ عید کی آمد آمد تھی لیکن اس بار کچھ مزے دار عید نہیں تھی... شہر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے اور دن بھر گولیاں چلتی رہتی تھیں... کئی بار میں اور میرا چھوٹا بھائی معین، گولی لگنے سے بال بال بچے۔ پھر ایک دن ہم لوگوں نے اپنا گھر چھوڑا اور ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ مگر راستے میں قافلے پر حملہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں بھائی اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے... قافلہ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ جس حصے میں ہم تھے اُس میں عورتیں اور بچے زیادہ تھے... ہمیں مسلمانوں کے ایک قریبی گاؤں تک پہنچنا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو سکھ بلوائی اُس گاؤں میں قتلِ عام کر کے آگ لگا چکے تھے۔ ہمارے قافلے والوں کو بھی انہوں نے قتل کر دیا... میں اور معین لاشوں کے نیچے دب جانے کی وجہ سے بچ گئے... ہم لوگ وہاں سے بھاگے اور قریب ہی واقع باجرے کے کھیتوں میں چھپ گئے۔

ان کھیتوں میں ہمارا قیام آٹھ دس روز رہا۔ یہ بڑے تکلیف اور پریشانی کے دن تھے۔ یہاں ہم دونوں بھائی تنہا تھے کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی اس مشکل سے نکالنے والا نہیں تھا۔ دن میں کھیتوں سے باہر والی دنیا سے خوف آتا تھا اور رات میں کھیت کے اندر کی دنیا سے وحشت ہوتی تھی۔

دن میں کھیتوں سے باہر لوگ چلتے پھرتے رہتے تھے اور ان سے خوف آتا تھا۔ نہ جانے باہر چلنے

پکڑنے والے کون ہوں ہر انسان وہی سکھ نظر آتا تھا جس نے گاؤں سے باہر ماں کی گود سے چھوٹے بچے کا پیٹ چاک کر کے اسے تلوار پر اوپر اٹھایا تھا۔ وہ منظر کسی طرح ذہن سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔

دن میں کھیت کے اندر بھی کبھی کبھی خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔ کوئی دیہاتی یا کسان کسی ضرورت سے کھیت کے اندر چلا آتا تھا تو ہماری حالت بری ہو جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بس اب کوئی پکڑ کر ہماری گردن کاٹ ڈالے گا یا پیٹ پھاڑ ڈالے گا۔ ہم نے کھیت کے اندر کنارے سے خاصی دور کچھ پودے اکھاڑ کر اتنا بڑا گڑھا کھودا ہوا تھا کہ جس میں ہم دن میں بیٹھ جائیں تو کھیت کے اندر گھس آنے والے کو نظر نہ آئیں کسی خطرے کے وقت میں ہم اس گڑھے میں چھپتے تھے تمام دن اس گیلی تہہ والے گڑھے میں نہیں بیٹھا جا سکتا تھا۔ اس گڑھے کا ایک اور فائدہ بھی تھا۔ اس کی دیواروں سے رس رس کر اس گڑھے کی تہہ میں پانی جمع ہو جاتا تھا۔ دن میں جب بھی پیاس لگتی تھی اور کھیت سے باہر نالے تک جا کر پانی پینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی تو گڑھے میں جمع ہو جانے والے اس گندے اور مٹیالے پانی کے ایک دو گھونٹ سے پیاس بجھا لیتے تھے۔

دن میں صبح اور شام کا وقت تو اچھا گزر جاتا تھا مگر دوپہر میں جب سورج سر پر ہوتا تھا تو دھوپ کی وجہ سے کھیت کی زمین سے بھاپ سی نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ بہت ہی حبس اور گرمی ہوتی تھی پسینہ خشک ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور سارے بدن پر خارش ہوتی تھی۔ ہمارے کھانے کا انتظام بھی اس کھیت میں تھا۔ بھوک لگتی تو باجرے کے بٹے سے بیج دانے چبا چبا کر جیسے تیسے پیٹ بھرا جاتا تھا۔ پیٹ کا حال بھی خراب تھا۔ مگر علاج کچھ نہیں تھا۔ ایک روز بارش ہوئی تو کھیت میں کیچڑ ہی کیچڑ ہو گیا۔ باجرے کے کچھ پودے زمین پر بچھا کر بیٹھنے کی سہولت پیدا کی۔ ان ہی دنوں آنکھیں بھی دکھنے لگی تھیں۔

دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا تھا۔ مگر جیسے ہی اندھیرا پھیلتا وہی دن کا دیکھا بھالا کھیت خوفناک نظر آنے لگتا تھا۔ اندھیرا بڑا ہی ڈراونا ہوتا ہے۔ غرض شام کے بعد کھیت میں رہنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ہم دونوں رات ہوتے ہی کھیت سے باہر نکل کر بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں وہیں سو بھی جاتے تھے۔ مگر ڈراؤنے خواب ہمارے محافظ تھے۔ جن کے خوف سے بار بار آنکھ کھلتی تھی اور عموماً صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہی ہم کھیتوں میں جا گھستے تھے۔

کتنی ہی بار رات کو گھنٹوں بیٹھ کر چاند نکلنے کا انتظار کرتے تھے اور جب چاندنی پھیلتی تھی تو ہم اس "کھیت جیل" سے نکل کر کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکلتے تھے۔ مگر راستوں کا پتہ نہ کسی سمت کا ہوش چنانچہ اکثر صبح کو ان ہی کھیتوں کے آس پاس ہوتے تھے۔ رات میں کوئی کسان پانی دینے کے لئے کھیتوں کی طرف آتا تھا یا کسی کتے اور گیدڑ کی آواز آتی تھی تو ہمارا خون خشک ہونے لگتا تھا اور ہم سہم کر پھر کھیتوں میں جا

گئے تھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت شدید پیاس لگی۔ پیاس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ ہمارے، ہم پر جو خون آلود کپڑے تھے ان میں خون کے سڑنے سے بڑا تعفن پیدا ہو گیا تھا۔ اور جسم کی خارش بھی چین نہ لینے دیتی تھی۔ چنانچہ یہ سوچا کہ ہمت کر کے نالے تک جائیں وہاں اپنے کپڑے بھی دھو لیں گے پانی بھی پئیں گے اور نہائیں گے بھی۔ بالآخر ہمت کر کے ہم دونوں بھائی اس نالے تک پہنچ گئے جہاں سے زخمیوں کو پانی پلایا تھا۔ نالے میں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہم نے وہاں پانی پیا کپڑے دھوئے اور کنارے پر پھیلا کر نالے میں بیٹھے ان کے خشک ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جتنا وقت ہم نالے پر رہے دور دور کسی آدمی کا نام نشان نہیں تھا۔ جس سے ہماری بے خوفی بڑھی۔

پانی میں بیٹھے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ پانی میں ایک الگ رنگ کی دھاری چل رہی ہے اور پانی میں کچھ بدبو بھی تھی۔ ہم نے کپڑے پہنے اور دھاری کا راز معلوم کرنے اس سمت چل دیئے جدھر سے یہ دھاری آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور چل کر اس دھاری کا راز معلوم ہو گیا اور خوف سے ہماری گھگھی بندھ گئی۔ بدن کانپنے لگا۔ ایک سڑی ہوئی لاش نالے میں پڑی تھی جس کے چاک پیٹ سے گندگی نکل کر آہستہ آہستہ پانی کے بہاؤ پر چل رہی تھی۔

اس خوفناک منظر نے ایسی دہشت پیدا کی کہ ہمارے منہ سے چیخ بھی نہ نکلی۔ ہم تیزی سے واپس پلٹے۔ مگر ابھی تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک للکار نے ہمارے قدم روک دیئے۔ نالے کے پار تین نوجوان سکھ کھڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں بھالے تھے۔ تینوں نالہ پھلانگ کر ہماری طرف آ گئے۔
"اوئے! تم مسلمان ہو؟" ایک لمبے قد والے سکھ نے میرے کندھے پر بھالے کی نوک لگا کر پوچھا "جی!" میں نے بمشکل جواب دیا۔ وزنی بھالے کی نوک دھیرے دھیرے میری کھال کو چیر کر گوشت میں پیوست ہو رہی تھی۔ "تمہارے پاس کوئی پیسہ دھیلا ہے؟" ...... "جی نہیں" ...... میرے جواب پر سکھوں کا اطمینان نہیں ہوا۔ انہوں نے ہمارے گلوں میں تعویذ ادھیڑ کر ان میں پیسے تلاش کرنا چاہے مگر مایوسی ہوئی ...... "اوئے! تمہاری جیب میں کیا ہے؟" ...... "کچھ بھی نہیں!" میں نے تو اپنے طور پر سچ ہی بولا تھا مگر میں بھول گیا تھا کہ میری جیب میں گڑ کی ڈلی بھی ہے جو کبھی گھر میں اپنی جیب میں رکھ لی تھی اور اب خون اور پانی میں بھیگ کر یہ ڈلی جیب میں چپکی ہوئی تھی سکھ کو میرا یہ نادانستہ جھوٹ اچھا نہ لگا اور اس نے سزا کے طور پر ایک زور دار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں بری طرح چکرا گیا اور میرا پورا بدن بھی ہل گیا۔ کندھے پر ٹکے ہوئے بھالے کی نوک گھوم گئی اور میری چیخ نکل گئی۔

کندھے سے خون بہہ کر قمیص کی آستین کو سرخ کر گیا۔ معین نے یہ خون دیکھ لیا تھا۔ میری چیخ

نکلی تو وہ خوفزدہ ہو کر "بھائی جان کو مار دیا، بھائی کو مار دیا" چیختا ہوا بھاگ نکلا۔ سکھ خوفزدہ معین کو بھاگتے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ وہ ہمیں مارنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے خوف زدہ ہونے کا تماشا دیکھ کر تھوڑی دیر میں مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔

ان کے غائب ہونے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے معین کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ بہت آوازیں دیں ہر سمت بہت دوڑا بھاگا مگر معین کا دور دور کہیں پتہ نہیں تھا۔ یہ ایک نئی آزمائش تھی۔ کھیت والی "جیل" میں بھی اگرچہ ہم دونوں بھائی رہ گئے تھے مگر ایک دوسرے کے لئے سہارا تو تھے۔ ساتھ مل کر باتیں کر لیتے تھے ایک دوسرے کو تسلی دے لیتے تھے اب وہ سہارا بھی نہ رہا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد میں معین کی تلاش سے مایوس ہو کر گڑھے والے کھیت میں آ گیا۔ امید یہ تھی کہ معین بھی بالآخر وہیں پہنچ جائے گا۔ مگر پوری رات بیت گئی۔ معین نہ پلٹا۔ مجھے اپنی تنہائی سے زیادہ معین کی تنہائی سے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ چھوٹا تھا اور یہ سوچ سوچ کر میرا برا حال تھا کہ اکیلا ہو کر چھوٹا بھائی کتنا خوفزدہ ہو گا۔ کیسا سہم رہا ہو گا۔ نہ جانے کیا کر رہا ہو گا۔ ایسے ہی خیالات مجھے مسلسل پریشان کر رہے تھے۔

پورا دن گزر گیا اور معین کا کہیں کھوج نہ لگا۔ پھر رات ہو گئی اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ سوتے میں مجھے معین کی رونے کی آواز سنائی دی میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور غور کرنے لگا کہ معین کی آواز محض خواب تھا یا واقعی وہ معین کی آواز تھی۔ یہ واقعی خواب نہیں تھا۔ معین کے رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بہت دیر تک آواز کے پیچھے بھٹکنے کے بعد میں بالآخر معین کے پاس پہنچ ہی گیا۔ وہ ایک بڑے سے درخت کے نیچے ٹوٹی ہوئی اینٹ کے روڑوں کے ڈھیر پر اوندھا پڑا سو رہا تھا اور سوتے میں رو رہا تھا۔ میں نے اسے نیند سے بیدار کیا اور پھر دونوں بھائی لپٹ کر خوب روئے۔ معین نے مجھے بتایا کہ اس نے دن بھر میں جانے کہاں کہاں سے یہ اینٹ روڑے اس لئے جمع کئے تھے کہ "بھائی جان کو مارنے والے سکھوں کو ان روڑوں سے ماروں گا۔

ہم دونوں اپنی کھیت جیل میں لوٹ آئے اور اگلا پورا دن کھیت ہی میں گزرا۔ شام کو بارش ہوئی اور اس بارش نے نئے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ کندھے کا زخم بھیگنے سے اگلی صبح تک کندھا اکڑ گیا اور اس میں شدید درد ہونے لگا۔ بازو ہلایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس تکلیف ہی میں کراہتے ہوئے صبح ہوئی۔ ابھی دھوپ زیادہ تیز نہیں ہوئی تھی کہ ہمیں کھیت میں کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ ہم فوراً لپک کر گڑھے میں جا بیٹھے کچھ وقفے سے پھر کھیت میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ ہم پریشان ہو گئے۔ جب یہ سرسراہٹ ہم سے خاصی قریب ہو گئی۔ تو ہم نے گڑھے سے نکل کر بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ ہم گڑھے سے نکل کر آگے بڑھے تو یوں لگا کہ جیسے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ کوئی ہمارے پیچھے پیچھے تھا اور ہم آگے آگے۔ ہمارے دل

زور زور سے دھڑک رہے تھے، سانس پھول رہا تھا اور خوف کے مارے برا حال تھا۔

"کاکا" یہ تھکی تھکی سی آواز کسی عورت کی تھی۔ مگر ہمارا خوف پھر بھی نہ ٹلا اور ہم آگے بڑھتے رہے۔ "کاکا! رک جاؤ اور میری بات سنو" مہربان سے لہجے والی یہ آواز سن کر ہم بالآخر رک گئے۔

ایک ادھیڑ عمر دیہاتی عورت ایک بچے کو پیٹھ پر لادے جھکی جھکی چل رہی تھی اور دوسرے بچے کو وہ ہاتھ پکڑے ساتھ لا رہی تھی۔ پیٹھ پر لدا ہوا بچہ سو رہا تھا یا نڈھال تھا اور بڑا بچہ بے حد سہما ہوا تھا۔ ایک بچے کی عمر ڈیڑھ دو سال اور دوسرے کی عمر تین چار سال ہوگی۔ دونوں بچے اتنے خاموش تھے کہ گونگے محسوس ہو رہے تھے۔ یہ بچے بھی غالباً اس عورت کے نہیں تھے لاوارث تھے اور ہماری طرح جوان لاوارث بچوں کا بھی سہارا بنی تھی۔

اس عورت نے "میرے پتر" کہہ کر ہمیں سینے سے لگا کر پیار کیا اور پاس بٹھا کر ہم سے ہماری ساری کہانی سنی۔ کرید کرید کر ہمارے حالات معلوم کئے ہماری گھریلو زندگی کی تفصیلات پوچھیں اور ہم دونوں کو اپنے زانو پر سر رکھ کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔ ہم زیادہ دیر تو نہیں سوئے مگر جتنا بھی سوئے پہلی بار بڑی اطمینان کی نیند سوئے۔

سو کر اٹھے تو ان بڑی بی نے عجیب ڈرامہ شروع کیا۔ انہوں نے ہمیں بتانا شروع کیا کہ وہ ہماری اصلی ماں ہیں جنہیں ہم اتنے دن علیحدہ رہ کر بھول گئے ہیں۔ انہوں نے سونے سے پہلے ہم سے ہمارے جو حالات سنے تھے وہی ہمیں سنا سنا کر یہ یقین دلانا شروع کیا کہ وہ واقعی ہماری اصلی ماں ہیں اور ہم انہیں بھلا بیٹھے ہیں۔ ان بڑی بی کی صورت اور حلیہ امی جان والا نہیں تھا اور پھر ان کی زبان بھی دوسری تھی۔ بڑی بی صرف پنجابی ہی بول سکتی تھیں جبکہ ہمارے گھر میں اردو ہی بولی جاتی تھی۔ وہ بڑی بی ہماری ماں ہیں اس کا تو ہمیں یقین نہیں آیا۔ مگر اس تنہائی میں ہمیں بہرحال ماں کی ضرورت تھی۔ اور یہ ضرورت عارضی طور پر یہ بڑی بی پوری کر رہی تھیں، اس لئے میں نے بڑی بی کی بات مان لی اور معین کو بھی سمجھا بجھا کر چپ کرا دیا۔

بڑی بی کو جیسے میرے کندھے کی تکلیف کا علم ہوا انہوں نے دوپٹے کے پلو کو منہ سے گرم کر زخم کی جگہ سکائی کی اور دوپٹے ہی سے پٹی پھاڑ کر اُس زخم کو ڈھانک دیا۔ یہ سب میری تکلیف کو کم کرنے اور مجھے تسلی دینے کا حیلہ بہانہ تھا ورنہ وہ بیچاری اس کھیت میں زخم اچھا کرنے والی دوا یا مرہم کہاں سے لاتیں بہرحال ان بڑی بی کی محبت کا ایک اثر یہ ہوا کہ ہمارا اب تک کا صبر اور ضبط رخصت ہوا اور ہم دونوں بھائیوں نے رونا اور ضد کرنا شروع کر دیا کہ ابا جان اور دوسرے بہن بھائی کہاں ہیں؟ اُن کے پاس لے کر چلئے۔ بڑی

بی نے وعدہ کر کے ہمیں چپ کرایا کہ وہ مل کو ہمیں لے کر گھر چلیں گی۔

اگلے روز وہ بڑی بی واقعی ہم بچوں کو لے کر دوپہر کے وقت کھیت سے نکل کھڑی ہوئیں چار بچوں اور بڑی بی پر مشتمل اس قافلے کا سفر اس طرح شروع ہوا کہ سب سے چھوٹا بچہ بڑی بی کی گود میں تھا۔ تین چار سال کی عمر والے بچے کو انہوں نے کندھے پر بٹھایا اور معین کو پیٹھ پر لادا اور مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ معین کو بھی پیٹھ پر لادنے کی نوبت اس لئے آئی گرم ریت پر ننگے پاؤں چلنا مشکل تھا۔ اور معین نے پاؤں جلنے پر رونا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میری ہمت بھی جواب دے گئی اور میں نے ضد شروع کر دی کہ مجھے بھی گود میں اٹھایا جائے۔ بڑی بی نے میری ہمت بندھائی اور میری ضد کو ٹالتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئیں تھوڑی دیر میں ہم ریل کی پٹڑی پر پہنچ گئے۔ لکڑی کے سلیپروں پر گرم ریت کی بہ نسبت چلنا آسان تھا۔ اس لئے بڑی بی نے معین کو بھی پیٹھ سے اتار دیا۔ وہ خود بیچاری ہانپ رہی تھیں۔ وہ غالباً ہمیں کسی قریبی ریلوے اسٹیشن کی طرف لے کر چل رہی تھیں کہ جہاں سے پاکستان جانے والی کوئی گاڑی مل سکے۔

ابھی کچھ زیادہ دور نہ چلے تھے کہ کچھ دور اونٹوں پر سوار ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے دو سکھ ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ وہ اتنے قریب تھے کہ ان کی نظروں سے چھپ کر بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ اور چھپنے کے لئے آس پاس کوئی کھیت بھی نہیں تھا۔ بڑی بی نے جلدی سے مجھے سمجھایا کہ "ہاتھ جوڑ کر ان سے کہو کہ پیر جل رہے ہیں چلا نہیں جا رہا اس لئے ہمیں اونٹوں پر بٹھا لو۔" بڑی بی نے یہ باتیں مجھ سے اس لئے کہلوائیں کہ بچے کی درخواست سن کر سکھوں کو رحم آ جائے اور وہ ہم لوگوں کو جان سے نہ ماریں۔ میں نے بڑی بی کی ہدایت کے مطابق جب ان سے اونٹ پر بٹھانے کی درخواست کی تو سکھوں نے واقعی ہم لوگوں کو اونٹوں پر بٹھا لیا۔

یہ زندگی میں اونٹ پر ہماری پہلی سواری تھی اور وہ بھی اونٹوں کی ننگی پیٹھوں پر۔ یہ سفر بڑا تکلیف دہ مگر مختصر تھا۔ جلدی ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے۔ ایک تنگ اور چھوٹی سی گلی طے کر کے ایک بڑے اونچے دروازے والے گھر کے سامنے جا کر رکے جہاں لمبے قد گوری رنگت اور مہربان صورت والا ایک بوڑھا سکھ کھڑا کھلے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔ اس کے لمبے سفید بال اس کی ایڑیوں کو چھو رہے تھے۔ یہ گاؤں کا سردار تھا۔ اور نیک دل انسان تھا۔ اس کی اجازت سے اندر پہنچے اور بڑے سے صحن میں بہت سے لوگوں کو دیکھ کر ہم پھر خوف زدہ ہو گئے۔ کھلے صحن میں بوریوں کا فرش بچھا تھا اور ہر طرف زخمی لوگ پڑے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کو ہم نے پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو آٹھ دس روز پہلے والے قتل عام کا نشانہ بنے تھے۔

(جاری ہے)

مسٹر عالمگیر

کاشف عرفان

ہاتھوں میں ہر وقت غُلیل جس دَم دیکھو اُس دَم کھیل
اب ہو حیرت کی تصویر یوں تو ہونا ہی تھا فیل
بولو مسٹر عالمگیر

عقل تمہاری کھا گئی گھاس علم نہ آیا تم کو راس
کرتے پڑھنے کی تدبیر محنت کرتے ہوتے پاس
بولو مسٹر عالمگیر

ایسی چالاکی پر خاک بنتے تھے کتنے چالاک
دیکھی شیخی کی تاثیر فیل ہوئے اور قصّہ پاک
بولو مسٹر عالمگیر

کب ہے یہ مزدور کا کام قسمت کو دینا الزام
کرتے ہو اپنی تشہیر کیوں ہوتے ہو یوں بدنام
بولو مسٹر عالمگیر

ہوگیا جو ہونا تھا یار اب پچھتانا ہے بے کار
بدلو خود اپنی تقدیر اب بھی ہو جاؤ تیار
بولو مسٹر عالمگیر

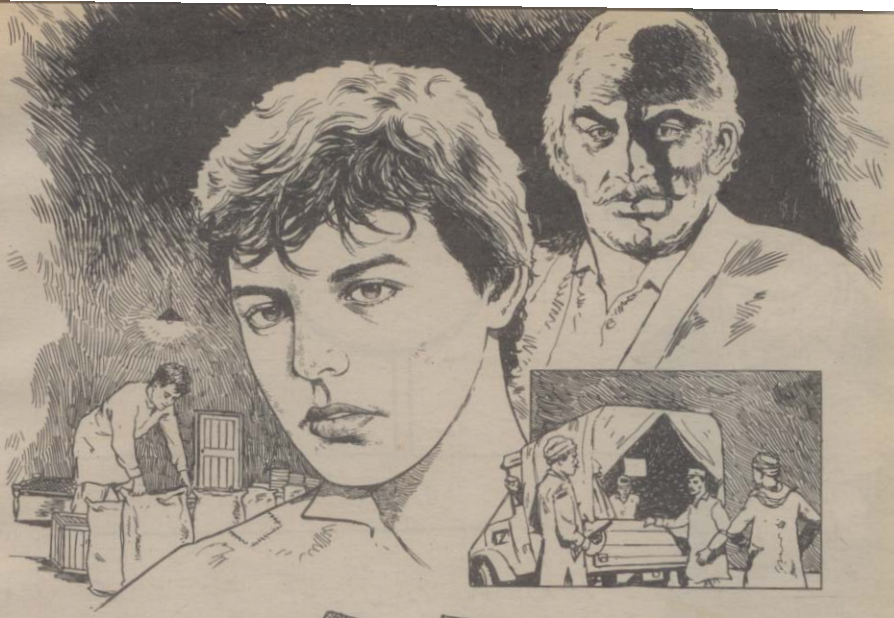

دلدل

قسط نمبر ۶

حمید کاشمیری

راشد کا باپ رمضان ڈرائیور، ہیروئن پینے کا عادی تھا۔ راشد کو بھی ویڈیو گیم کی لت پڑ گئی تھی ۔ وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتا ۔ اس کی ماں ان دونوں باپ بیٹوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان رہتی ۔ ایک روز جب راشد حسبِ معمول جب ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا، اُس کی ماں روتی پیٹتی وہاں آئی اور یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے ۔ باپ کے مرنے کے بعد راشد کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اُس نے بُری عادتوں سے

تو بہ کر لی. تعلیم حاصل کرنا تو اُس کے لئے ممکن نہ تھا. البتہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اُس نے اپنے والد کے دوست رحمت مستری کی ورکشاپ پر کام کرنا شروع کر دیا. ان دنوں شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے. آئے دن کے ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی تھی. راشد کا گھر تو بفر زون کے علاقے میں تھا اور ورکشاپ میوہ شاہ قبرستان کے قریب ہر روز آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا. کسی ممکنہ بُری خبر سے بچنے کے لئے رحمت مستری نے راشد کی والدہ سے بات کر کے راشد کو رات دن مستقل اپنے ورکشاپ پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا. وہ دن بھر تو خوشی خوشی کام کر لیا کرتا تھا لیکن یہ پہلی رات کاٹنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا. وہ اس آسیب زدہ ماحول میں ڈر رہا تھا. وہ بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی. خوف کی ایک لہر بار بار اُس کے بدن میں بار بار جُھرجُھری پیدا کر دیتی آخرکار وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا.

اُس کے اُٹھ بیٹھنے سے اس کے ساتھی بھی اُٹھ بیٹھے اور یوں خوفزدہ ہونے پر اس کا مذاق اُڑایا. لیکن راشد سچ مچ ڈر رہا تھا. اس پر ان لوگوں کی تلقین کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب وہ منہ لپیٹ کر سو گئے تو راشد تکیہ اور چادر بغل میں دبا کر ورکشاپ کی چھت پر چڑھ گیا... کافی دیر اِدھر اُدھر کے خیالات اُسے ستاتے رہے. پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہو گیا. نجانے رات کا کون سا پہر تھا. جب وہ ہڑبڑا کر اُٹھا... اُس نے دیکھا کہ چند لوگ میت گاڑی میں سے اُترے اور ایک میت کو اُٹھا کر قبرستان کے اندر لے گئے جہاں انہوں نے اس کفن پوش کو ایک تازہ کھُدی ہوئی قبر میں اُتار دیا... لیکن راشد نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ قبر میں اُتاری جانے والی چیز لاش نہیں بلکہ لکڑی کی دو پیٹیاں تھیں.

صبح سویرے سب سے پہلے اکو کی آنکھ کھُلی. اُس نے دیکھا تو راشد کو نہ پا کر پریشان ہو گیا. اسلم اور گولا بھی جاگ گئے اور انہوں نے راشد کو چھت پر سوتا ہوا دیکھ لیا. ان کے جگانے پر راشد نیچے اُترا اور رات کا سارا واقعہ اُنہیں سُنایا، مگر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا. تینوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا. تھوڑی دیر بعد اُستاد بھی ورکشاپ پر آ گئے. ان کے ساتھ ایک صاحب تھے. شاہ جی. یہ چاروں شاہ جی ہی کی کار کو ٹھیک کر رہے تھے. گولے نے استاد کو بھی راشد کے بارے میں بتایا اور استاد کے پوچھنے پر راشد نے ایک بار پھر رات والا واقعہ دہرایا. اسے سُن کر اُستاد سے زیادہ شاہ جی چونکے لیکن بات ٹال گئے. گاڑی کی ٹرائی لینے کے لئے شاہ جی اپنے ساتھ راشد کو لے گئے. اور راستے میں تمام حالات معلوم کئے. راشد نے اُنہیں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا. شاہ جی نے اُسے اپنا بنگلہ دکھایا اور کسی بھی ضرورت کے وقت اپنی مدد کا یقین دلایا. راشد واپس آ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا. رات کے وقت اُسے کسی ضرورت سے قبرستان جانا پڑا تو واپسی میں عیسیٰ گورکن سے ملاقات ہو گئی. عیسیٰ گولے کا باپ تھا. اور اُسے بھی راشد کی زبانی رات والے قصّے کا علم ہو چکا تھا. وہ اُسے ایک تازہ کھُدی ہوئی قبر کے پاس لے گیا اور اُسے زبردستی قبر میں گرا کر اُس پر مٹی ڈالنے لگا. باوجود کوشش کے خوف کی وجہ سے راشد کی آواز نہ نکل سکی.

راشد قبر میں پڑا تھا. عیسیٰ گورکن اُسے دھمکیاں دینے کے علاوہ دھیرے دھیرے مٹی اُس کے اُوپر ڈال رہا تھا. اُس نے کئی بار کوشش کی کہ چیخے یا زور لگا کر مٹی کے اس ڈھیر سے باہر نکل جائے مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے. وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوا. اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا. لیکن پھر قدرت کو اُس پر رحم آ گیا. عیسیٰ گورکن کی ننھی بچّی نوشی کہیں سے اُسے ڈھونڈتی ہوئی اُدھر آ نکلی. وہ راشد کو زندہ دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہوئی مگر عیسیٰ نے بات بنائی کہ وہ تو قبر کا ناپ لے رہا تھا. نوشی کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی. عیسیٰ نے اُسے قبر سے نکالا اور دھمکیاں دے کر بھگا دیا. راشد کی کیفیت بڑی عجیب ہو گئی تھی. وہ تاریک سڑک پر چلا جا رہا تھا اب اُسے کسی چیز کا خوف نہیں رہا تھا. وہ ایک چائے خانے پر پہنچا. اُس نے چائے پینے کے دوران نشہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک بوڑھے ہیروئنچی کو تڑپتے ہوئے دیکھا. وہ دس روپے مانگ رہا تھا. راشد نے اُسے دس روپے دیئے تو وہ فوراً نشے کے حصول کے لئے وہاں سے بھاگ گیا. اس نشے کے عادی شخص کا ایک معصوم بچّہ جو اُسے گھر لے جانے کے لئے آیا تھا رونے لگا. امجد سے گفتگو کے دوران راشد کو پتا چلا کہ امجد کی کہانی بھی بالکل راشد جیسی ہے. راشد افسردہ ہوا. اور وہاں سے واپس آ گیا. راستے میں اُسے ایک کار والے نے روکا اور کار میں بٹھا لیا. یہ شاہ جی تھے. راشد نے شاہ جی کو بھی تمام واقعات سُنائے. شاہ جی فوراً عیسیٰ گورکن کے گھر پہنچے اور اُسے دھمکی دی کہ اگر آئندہ اُس نے راشد کو تنگ کیا یا اُس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اُس کی خیر نہیں ہو گی. ابھی یہ لوگ عیسیٰ کے گھر سے چند قدم دُور ہی گئے تھے کہ کسی جانب سے دو فائر ہوئے اور عیسیٰ خون میں لت پت زمین پر گر پڑا.

شاہ جی نے فوراً عینی کو گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے۔ لیکن اُس نے رستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔ اگلے دن ورکشاپ بند تھی۔ سب لوگ عینی گورکن کے گھر پر جمع تھے۔ بستی کے تمام ہی لوگ وہاں آ گئے تھے۔ سارے محلے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ قاتلوں کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ شاہ جی اب راشد کی طرف سے فکر مند تھے۔ انہوں نے رحمت مستری اور راشد دونوں کو ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ اب راشد ہی واحد چشم دید گواہ تھا جو مجرموں کو پکڑوا سکتا تھا۔ شاہ جی نے راشد کی مدد سے وہ قبر بھی دیکھ لی... قبرستان میں اُن کی ملاقات عینی گورکن کے مددگار رزاق سے ہوئی لیکن اُس سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ راشد کا دل اب کام میں نہیں لگتا تھا۔ اُس نے شاہ جی سے پولیس کی مدد کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اب اُس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ رات کو بھی باہر ہی سویا۔ پھر رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جب چند نقاب پوشوں نے اُسے اغوا کر کے ایک بند وین میں سوار کر دیا۔

اگلے دن قبرستان کی بستی میں کہرام مچا ہوا تھا۔

اس دن معمول کے مطابق صبح جب اسلم اکو اور گورا کھلے آسمان کے نیچے بیدار ہوئے تو راشد کو اپنے پاس نہ پا کر شروع میں انہیں کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پہلے وہ یہی سمجھے کہ شاید جلدی اٹھ گیا ہے اور ضرورت کے تحت ادھر ادھر گیا ہو گا۔ لیکن جب سورج طلوع ہونے تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو پھر تینوں کو تشویش ہونے لگی پھر اتنے میں استاد رحمت بھی گیراج پر آ گیا اور جب استاد کو راشد کے لاپتہ ہونے کی اطلاع ملی تو وہ بہت فکر مند ہو گیا تاہم اس نے لڑکوں کو اپنی گھبراہٹ کا احساس نہیں ہونے دیا۔ استاد نے جلدی جلدی شاگردوں کو گاڑیوں پر کام سے لگا دیا اور خود ایک گاڑی لے کر چپ چاپ راشد کی تلاش میں نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے گیراج پر بتا دیا کہ وہ کہیں کام سے جا رہا ہے اور ایک آدھ گھنٹے میں لوٹے گا۔ استاد گیراج سے سیدھا بفرزون راشد کے گھر پہنچا۔ اس وقت راشد کی ماں رابعہ کے لئے کچھ کھچڑی بنا رہی تھی۔ استاد رحمت کو صبح کے وقت اور اچانک دیکھ کر حیران سی ہوئی بلکہ پریشان بھی ہو گئی۔ کیونکہ رحمت کی آمد بالکل اچانک اور غیر متوقع تھی۔

"کیا حال ہے بہن خیریت سے ہو....." استاد رحمت نے رسمی طور پر خیر خیریت دریافت کی۔

"شکر ہے اللہ کا۔ تم سناؤ بھائی صاحب ٹھیک ہو" راشد کی ماں نے بھی رسمی جواب دیا۔

"کرم ہے مولا کا....." استاد رحمت بولا اور مکان میں ادھر ادھر جھانکنے لگا کہ شاید کہیں راشد نظر آ جائے۔ "کیا حال ہے اب رابعہ بیٹی کا ٹھیک ہے ناں" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ راشد کے بارے میں کس طرح پوچھے۔

"خدا کا شکر ہے بہت ٹھیک ہے اب" راشد کی ماں بولی۔

"راشد بھی ٹھیک ہے ناں" وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ لیکن فوراً اسے احساس ہوا کہ شاید اس

سے غلطی ہو گئی ہے۔

"بھائی صاحب راشد کے بارے میں تو آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔" راشد کی ماں بولی۔ "میرے پاس تو ہفتے میں ایک دن آتا ہے۔ پرسوں شام کو آیا تھا کل صبح چلا گیا ہے۔"

"آج تو نہیں آیا تھا ناں۔" وہ پھر بول اٹھا۔

"آج..... راشد کی ماں چونکی۔ نہیں آج تو نہیں آیا..... کیوں کیا بات ہے۔ اور آپ کیسے سویرے سویرے خیریت تو ہے ناں....." ماں گھبرا گئی۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں..... میں ادھر کسی کام سے آیا تھا سوچا آپ کی خیریت پوچھ لوں۔" استاد نے بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

"راشد کارخانے میں نہیں ہے کیا؟" ماں نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں ہاں کارخانے میں کیوں نہیں ہے۔ میں دراصل کارخانے صبح سے گیا ہی نہیں۔" استاد رحمت بظاہر اطمینان سے بولا "تو پھر ادھر کیوں آئے گا وہ؟" ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یونہی میں نے پوچھا ہے بہن۔" استاد رحمت بوکھلاہٹ میں بولا "دراصل ایک گاڑی آج اس طرف گاہک کو دینی تھی میں نے کہا کہ شاید گاہک کے ساتھ ٹرائی پر ادھر نکل آیا ہو راشد۔ میں نے تو یونہی پوچھا"

"نہیں بھائی۔ وہ جمعہ کے علاوہ آتا ہی نہیں ہے۔" راشد کی ماں نے کہا۔ اور پھر رحمت کے لئے چائے بنانے لگی۔

"نہیں بہن چائے نہیں بنانا۔ میں نے ابھی ابھی چائے پی ہے۔ اور کچھ جلدی میں ہوں۔ گیراج پہنچنا ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "میں اس لئے آیا تھا کہ کوئی تکلیف ہو کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا۔"

"اللہ خوش رکھے بھائی صاحب۔" راشد کی ماں صبر و قناعت سے بولی "جب سے تم نے راشد کو سنبھالا ہے سارے تردّد دور ہو گئے۔ جو کچھ اسے دیتے ہو لا کے سیدھا میرے ہاتھ میں رکھتا ہے۔"

"راشد کی ماں احسان مندی کے لہجے میں بولی" اللہ تمہیں اس کا اجر دے بھائی صاحب۔" اس نے رحمت کو دعا دی لیکن استاد رحمت چپ چاپ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا وہ اس کی ماں کو فی الحال کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

"یا اللہ خیر....." استاد کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے واپس گیراج پر پہنچا.....

"کوئی خبر ملی.....؟" اس نے گیراج پر پہنچتے ہی لڑکوں سے پوچھا۔

"نہیں استاد....." تینوں شاگرد بیک آواز بولے۔ اتنے میں شاہ جی کی گاڑی رکی۔ استاد نے سارا ماجرا سنایا۔ شاہ جی بھی بہت پریشان ہو گئے۔ وہ بھاگے بھاگے واپس آئے اور پولیس کو چوکنا کر دیا پھر ایک طرف پولیس نے سارے شہر کی ناکہ بندی کر دی اور دوسری طرف پولیس قبرستان کے اندر اور باہر راشد کی تلاش میں سب طرف پھیل گئی۔ شام تک راشد کی گمشدگی کی خبر ساری بستی میں پھیل گئی اور بستی میں کہرام مچ گیا۔

"دو دن سے لوگ عیسیٰ گورکن کے گھر کی گلی میں تعزیت کے لئے جمع ہو رہے تھے اور آج شام استاد رحمت کے گیراج پر حال احوال پوچھنے اور افسوس کرنے والوں کا مجمع لگ گیا عیسیٰ گورکن کی بیٹی نوشی اس وقت بھی قبرستان میں اپنے باپ کی بنائی ہوئی قبروں پر پانی ڈال رہی تھی اس کا بھائی گولا اسے ڈھونڈتا ہوا قبرستان میں آنکلا۔

"نوشی کیا کر رہی ہو؟" گولے نے پوچھا۔

"قبروں کو ٹھنڈا کر رہی ہوں۔" وہ قدرے روتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چلو گھر اماں بلا رہی ہے....." گولے نے کہا۔ "آج کل بستی میں بہت خطرہ ہو گیا ہے۔"

"کیوں خطرہ ہو گیا ہے گولے.....؟" وہ آبدیدہ ہو گئی "کس نے مارا ہے ہمارے بابا کو؟"

"شاید انہی لوگوں نے جنہوں نے راشد کو اغواء کیا ہے۔" گولے نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"راشد کو کس نے اغواء کیا ہے گولے؟" نوشی تجسس سے بولی۔

"پتہ نہیں....." گولے نے لاعلمی ظاہر کی۔

"راشد اچھا لڑکا تھا....." نوشی نے بڑے جذباتی لہجے میں بے ساختہ کہا۔ "ہے ناں گولے؟" وہ مزید بولی۔

"تمہیں کیسے معلوم؟" گولے نے پوچھا "کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"میں بابا کی قبر پر رو رہی تھی ناں۔ تو اس نے مجھے چپ کرایا تھا۔ مجھے تسلی دی تھی۔" وہ اور سنجیدہ ہو گئی۔

"ہاں نوشی وہ واقعی بہت اچھا لڑکا تھا۔" گولے نے جواب دیا۔ "ہم اس کی باتوں کا یقین ہی نہیں کیا کرتے تھے۔"

"وہ کہاں چلا گیا۔ اسے کس نے مارا ہے۔ اسے..... بابا کو..... یہ ہمارے پاڑے میں کیا ہونے لگا گولے..... کیوں؟" وہ بہت پریشان ہو گئی۔

"آجاؤ اب تو قبروں سے مجھے بھی ڈر لگنے لگا ہے" گولے نے نوشی کا ہاتھ تھاما اور دونوں قبرستان سے باہر چلے گئے۔

شام کو علاقے کے بڑے آدمی سردار عمر آسمانی جب واقع کی اطلاع پا کر مستری رحمت کے گیراج پر اپنے ملازموں اور ماتحتوں کے جلوس میں پہنچے تو بستی کے سارے لوگ ان کے آس پاس اکٹھے ہو گئے۔ سردار آسمانی نے مستری رحمت کو بھی اور علاقے کے دوسرے لوگوں کو بھی اطمینان دلایا کہ وہ اس طرح کی غنڈہ گردی اپنی بستی میں زیادہ دیر نہیں چلنے دیں گے اور یہ کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔

انہوں نے مختصر سی تقریر بھی کی جس میں مقامی انتظامیہ کو بُرا بھلا کہا اور سخت تنقید کی۔ ان کی تقریر جاری تھی کہ شاہ جی کی جیپ آن رکی۔ شاہ جی سادہ کپڑوں میں تھے لیکن ان کے ساتھ چند باوردی سپاہی بھی تھے۔ شاہ جی جب جیپ سے باہر نکلے تو سردار آسمانی اپنی تقریر کے دوران ایک لمحے کے لئے رکے اور پھر شاہ جی سے مخاطب ہو کر تنبیہ کرتے ہوئے شاہ جی کا نام پکار کر بولے۔

"سنو سید وارث حسین شاہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ وردی میں ہوں یا بے وردی۔ علاقے میں امن قائم کرنا آپ کی ذمہ داری ہے کل ہمارا ایک بندہ ہرو برو مارا گیا آج ایک بندہ اغواء ہو گیا۔ اگر اس طرح کی واردات پھر ہوئی تو یاد رکھنا آپ....."

"اس طرح کی واردات پھر نہیں ہو گی سردار صاحب مجرم ہماری نظر میں آ گئے ہیں....." شاہ جی اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"تو پھر پکڑتے کیوں نہیں مجرموں کو کیا بھاگ گئے ہیں وہ؟" سردار نے پوچھا

"نہیں سردار جی..... بہت قریب ہیں۔ بس میرا ہاتھ ان کی گردن تک جانے کی دیر ہے صرف تھوڑی سی قانونی مشکلیں ہیں۔" شاہ جی معنی خیز انداز میں بولے اور سردار شاہ جی کی اس معنی خیز باتوں کو نظر انداز کرتے ہو رحمت مستری سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔

"یہ لڑکا جو اغواء ہوا ہے۔ ہم نے اس کو دیکھا ہے کیا؟"

"جی سردار جی۔" مستری رحمت نے جواب دیا "عیسائی گورکن کے گھر آپ جب تعزیت کے لئے آئے تھے تو راشد ایک جگ سے پانی وغیرہ پلا رہا تھا سب کو۔ آپ نے گیراج میں دیکھا ہے اسے۔" وہ مزید بولا، "بڑا اچھا لڑکا تھا۔"

"اللہ رحم کرے اس پر....." سردار جی دعائیہ انداز میں بولے اور پھر شاہ جی کی طرف دیکھ کر وارننگ دینے کے لہجے میں کہا

"افسر صاحب..... یہ لڑکا کل تک برآمد ہو جانا چاہئے"

"انشاء اللہ..... لڑکا اور مجرم دونوں برآمد ہوں گے" شاہ جی نے معنی خیز انداز میں کہا لیکن سردار جی نے شاہ جی کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

ادھر راشد کی ماں کو ابھی تک راشد کی گمشدگی کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

.....○.....○.....

جس کمرے میں اغواء کرنے والوں نے راشد کی پٹی کھولی وہ گھپ اندھیرا کمرہ تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت کمرے میں آنے تک اس نے جو قدموں کی چاپ سنی تھی اس سے راشد نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کو اغواء کرنے والے چار آدمی تھے۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد اس نے اپنی سماعت اور سوچنے سمجھنے کی حس کو مکمل طور پر چوکس اور بیدار رکھا تھا گاڑی کے اندر اس کے ساتھ دو آدمی تھے جو کبھی کبھار آپس میں بات کر لیتے تھے پھر جب وین سے اسے اتارا گیا تو آوازیں چار ہو گئیں اور قدموں کی آہٹ بھی چار آدمیوں کی تھی پھر جب مکان کے اندر اسے لے جایا گیا تو اسے پیچھے کے دو کمروں سے گزارا گیا۔ اس طرح راشد نے محسوس کیا کہ تین آدمی تو باہر کے ہی دو کمروں میں رہ گئے اور چوتھا آدمی اسے اندر لے گیا جہاں چوتھے آدمی نے اس کی پٹی کھول دی۔ راشد نے محسوس کیا کہ پٹی کھلنے کے باوجود اندر گھپ اندھیرا تھا پھر جب کمرے کی بتی جلی تو یکدم روشنی کی چمک سے اسے جھٹکا سا لگا جیسے کسی نابینا کو روشنی ملتی ہے اس کے محافظ نے ابھی تک منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا راشد نے اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھتے ہوئے ڈھاٹا باندھے آدمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر کمرے کا سرسری جائزہ لیا یہ ایک بہت بڑا ہال نما کمرہ تھا جس کے آدھے کمرے کی کیفیت سے پتہ چلتا تھا کہ جیسے کوئی گودام ہو اور آدھے کمرے میں دو چار کرسیاں پلنگ اور پرچ پیالیاں وغیرہ تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید یہاں کوئی رہتا بھی ہو گا یا راشد جیسے لوگوں کو یہاں رکھا جاتا ہو گا۔ برابر میں ایک دروازہ تھا جو اندر ہاتھ میں کھلتا تھا۔

"یہ کرسیاں ہیں یہ پلنگ ہے بیٹھنا ہے تو بیٹھے رہو لیٹنا ہے تو لیٹ جاؤ۔ اور ضرورت پڑے تو یہ برابر میں غسل خانہ ہے" ڈھاٹا باندھے آدمی نے ایک ہی سانس میں کہا اور پھر کہنے لگا "رب راکھا۔ صبح ملاقات ہو گی" یہ کہہ کر ڈھاٹے والا آدمی کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازہ باہر سے مقفل ہو گیا۔

اب راشد ایک قید خانے میں تھا اور یہ قید خانہ کہاں تھا اسے کچھ معلوم نہ تھا اپنے اندازے

ے صرف اتنا جانتا تھا کہ غالباً یہ جگہ یونیورسٹی کے پاس ہے کیونکہ گاڑی اس کے حساب سے شمال کی طرف گئی اور پھر مغرب کی جانب گلشن کی جانب مڑ گئی لیکن پھر حیران کن بات یہ تھی کہ راستے میں اسے سمندر یا دریا کی لہریں ایک جگہ سے سنائی دی تھیں جو کہ گلشن کی طرف نہیں ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ کلفٹن کی طرف کسی ویران علاقے میں ہو۔ لیکن اس بات کا امکان اسے کم معلوم ہوتا تھا۔ جس گاڑی میں اسے اغواء کیا گیا تھا وہ ٹھیک ٹھاک تیز رفتار کے ساتھ تقریباً تینتالیس منٹ چلی تھی گاڑی کے دورانیہ کا اندازہ اس نے گنتی سے کیا تھا کیونکہ گاڑی جب اسے لے کر روانہ ہوئی تھی تو اس نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھ کر دیوار کی گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح دل ہی دل میں سیکنڈوں کی گنتی شروع کر دی تھی۔ رات کا وقت تھا سڑکیں صاف تھیں سگنل کھلے ہوئے تھے اور گاڑی کسی جگہ رکی نہیں تھی گاڑی رکی اس وقت جب راشد نے اپنی گنتی دو ہزار پانچ سو اسی مکمل کی اس طرح راشد نے جب ۲۵۸۰ سیکنڈوں کو ضرب تقسیم کیا تو یہ کوئی ۴۳ منٹ کی ڈرائیونگ بنی جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ شہر کے اندر ہی ہے لیکن وثوق کے ساتھ وہ کچھ اندازہ نہیں کر سکا کہ کونسی جگہ ہے۔ وہ رات بالکل نہیں سویا صرف اندازے لگاتا رہا اور کمرے کا جائزہ لیتا رہا اس نے گودام کے تھیلوں کا معائنہ کیا کچھ خشک میوہ جات یعنی بادام وغیرہ تھے اس نے بوری میں سوراخ لگا کے کچھ بادام نکالے اور کٹکنانے لگا کسی بوری میں چھالیہ وغیرہ دکھائی دی کچھ میں دالیں تھیں کسی بوری میں چینی نظر آئی۔ پھر ایک جگہ رکھے ہوئے پلاسٹک کے کچھ اچھی قسم کے تھیلے تھے اس نے سوراخ لگا کے تھیلے میں ہلکا سا چھید کیا تو سفید پاؤڈر باہر نکلا پہلے وہ سمجھا کہ خشک دودھ ہے لیکن پھر وہ چونک پڑا اس نے دیکھا کہ یہ تو وہی سفید پاؤڈر تھا جسے ہیروئن کہتے ہیں اور جو وہ اپنے باپ کے پاس دیکھ چکا تھا اور جس کی طلب اور تپش نے اس کے خاندان کی خوشیاں تباہ کر دیں تھیں اور اس سفید پاؤڈر نے اس کے باپ کی زندگی چھین لی تھی۔ اس نے برابر میں ہی پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے تھیلے دیکھے اور جلدی سے کچھ مقدار میں سفید پاؤڈر ایک تھیلی میں ڈالا اور نیفے میں اڑس دیا اس کے بعد اس نے مزید تھیلوں کو چیک کیا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک ملی جلی اشیاء کا گودام ہے جس کے پردے میں ان لوگوں نے ہیروئن کے کاروبار کو چھپا رکھا ہے۔ پھر جب اسے گودام کی تلاشی کے دوران ایک تھیلے میں پسا ہوا نمک اور ایک میں پسی ہوئی مرچ بھی پلاسٹک کے تھیلے میں ڈالی اور ازار بند کے ساتھ سختی کر کے اسے بھی نیفے میں اڑس ڈالا اور جب کہیں دور سے لاؤڈ اسپیکر پر صبح کی اذان کی آواز سنائی دی تو اس وقت اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ چپ چاپ پلنگ پر چڑھ کر سو گیا لیکن پلنگ پر جاتے ہی اس کی آنکھوں سے نیند پھر غائب ہو گئی۔ ابھی وہ کروٹیں ہی لے رہا تھا کہ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی باہر کے کمرے میں کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں...... روشندان سے ہلکی ہلکی روشنی چھن کر اندر آنا شروع ہو گئی تھی وہ دیر سے

دھیرے اٹھا اور دروازے سے کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے لگا

"قبر سے نکال لائے ہو مال کھ بچے" ایک بھاری بھرکم آواز تھی راشد کو لگا کہ جیسے یہ جانی پہچانی آواز ہو۔

"جی سر...... آج ہی ہم نے قبر کا صفایا کر دیا" کھ بچے نے جواب دیا۔

"کسی نے دیکھا تو نہیں؟...." بھاری بھرکم آواز نے پھر پوچھا۔

"کون دیکھتا سر...... ایک سنتری ٹوہ لیتا ہوا آیا تھا۔ ہم نے اس کا بھی صفایا کر دیا"

شاوشے...... بھاری بھرکم آواز نے داد دی۔ اور پھر بولا "ذرا دروازہ تو کھولو میں اس لڑکے کو دیکھوں" راشد نے یہ بات سنی تو ایکدم دروازے سے ہٹا اور چھلانگ لگا کر پلنگ پر اس طرح لیٹ گیا جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔

کھڑک سے دروازہ کھلا...... اور دو آمیوں کے ساتھ جو رعب دار آدمی اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر راشد کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا

"سردار عمر آسمانی" راشد اندر ہی اندر دہل گیا اس کی جیسے گھگی بند گئی وہ اٹھ بیٹھا اس نے دو آدمیوں کو بھی پہچان لیا

"تو یہ ہے وہ۔ اسے تو دیکھا ہے میں نے......" سردار آسمانی دھیمے لہجے میں بولا۔

"تو اس کو پھر دیکھنا چاہتے ہو سردار......" پہلے آدمی نے رازداری سے پوچھا۔

"نہیں....." سردار نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر کیا اس کا صفایا......" دوسرے آدمی نے گردن اڑانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

"نہیں۔" سردار نے منع کرتے ہوئے کہا "ہم نے اب تک کسی بچے کو نہیں مارا ہے"

"تو پھر اس کا کیا کریں سر...." دوسرے آدمی نے پوچھا اور راشد دم بخود سنتارہ گیا سردار نے ایک لمحہ کے لئے سوچا پھر بولا،

"اسے خرکاروں کے حوالے کر دو...... جس قیمت پر بھی لیتے ہیں دے دو" سردار نے حکم دیا اور راشد اسی رات خرکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔

وہ پھر ایک ٹرک میں سوار تھا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی تھی۔ ٹرک جس سڑک پر جا رہا تھا وہ خاصی ویران سی لگ رہی تھی کیونکہ ٹریفک سڑک پر بالکل نہیں تھی۔ راشد صرف اتنا جانتا تھا کہ رات کا وقت ہے لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ٹرک کس گمنام منزل کی طرف اسے لے جا رہا ہے۔

(پھر کیا ہوا یہ دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات آئندہ ماہ پڑھنا نہ بھولئے)

قصّہ گو

شاہ نواز فاروقی

بہت دنوں پہلے بنگال کے ایک گاؤں میں ایک دودھ والا رہا کرتا تھا۔ وہ بہت زبردست قصّہ گو بھی تھا۔ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ایک نئی کہانی ایک نیا قصہ سنانے کے لئے تیار رہتا۔ کہانیاں اس کے منہ سے اس طرح نکلتیں جیسے برسات کے دنوں میں دریاؤں کے دہانوں سے پانی نکلتا ہے۔ وہ کہانیاں سنانے سے کبھی باز نہ آتا۔ حتیٰ کے اس وقت بھی نہیں جب گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑانے لگتے۔

"آج دھان کے کھیت میں پر جاتے ہوئے میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا" وہ کہتا "میں جارہا تھا کہ مجھے راستہ میں ایک سانپ ملا۔ سانپ نے جیسے ہی مجھے دیکھا میرے پیچھے دوڑا۔ میں خوب تیز بھاگا مگر اچانک میرا پاؤں گھاس میں الجھا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چند ہی لمحوں بعد سانپ مجھ تک آ پہنچا۔ اس نے اپنا بھیانک پھن اٹھایا اور پھنکارا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب بس مجھے کاٹنے ہی والا ہے۔ میں بڑی مشکل میں تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں اٹھ بیٹھا اور سانپ کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ میرے سوار ہوتے ہی سانپ لہراتا ہوا دوڑنے لگا۔ میں اس کی پیٹھ کو اچھی طرح پکڑے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم ایک ایسے تالاب پر جا پہنچے جس میں بے شمار کنول کے پھول کھلے تھے۔ سانپ مجھ سمیت تالاب میں کود پڑا۔ قبل اس کے کہ سانپ تالاب سے باہر نکلتا میں کنول کے تین چار پھول توڑ چکا تھا۔ پھر سانپ تالاب سے نکل کر میرے گھر کی طرف روانہ ہوا اور پھر اس سے قبل کہ میں اسے روکتا وہ ہمارے آموں کے باغ میں موجود ایک سوراخ میں گھس گیا۔ آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آرہا نا؟ اچھا آئیں میں آپ کو وہ سوراخ اور کنول کے وہ چاروں پھول دکھاؤں۔"

گاؤں کے لوگ ایسے قصے سن کر دودھ والے کا مذاق اڑاتے اُس پر دھول اچھالتے اور آموں کے چھلکے پھینکتے۔ مگر دودھ والا ہمیشہ کسی ایک نئی کہانی کے ساتھ ان کے درمیان موجود رہتا۔

"کل" وہ کہتا "میں نے ایک سورج مکھی کے پھول پر شہد کی مکھیوں کا چھتا دیکھا۔ میں جلدی سے سورج مکھی کے پودے پر چڑھا اور چھتے پر جا بیٹھا۔ اچانک بے شمار مکھیوں نے چھتے کو پکڑا اور میرے اترنے سے پہلے اسے لے کر اُڑ چلیں۔ وہ بلند سے بلند ہوتی جاتی تھیں۔ اب میں نیلے اور کالے بادلوں کے دیس میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے ٹھیک اوپر پہاڑ تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں نے ایک شہزادی کو جگنوؤں کا ہار بناتے دیکھا۔ میں نے اس کے ہار سے ایک جگنو لے لیا۔ اور پھر سورج کے ڈھلنے سے ذرا پہلے اپنے گھر آ گیا۔ اچھا آپ میری باتوں کا یقین نہیں کر رہے ہیں تو یہ دیکھئے! میرے ہاتھ میں جگنو اب بھی موجود ہے۔"

دودھ والے کی بیوی بڑی نیک صفت عورت تھی۔ گاؤں کے تمام لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ مگر گاؤں کے لوگ جب اسے آتا دیکھتے تو آوازیں کستے۔ "وہ دیکھئے قصہ گو کی بیوی آ رہی ہے۔ معلوم نہیں اس نے بھی سانپ کی سواری اور کنول کے پھولوں کی کہانی سنی ہے یا نہیں۔ اور پتہ نہیں کہ اس نے اپنے شوہر کو جگنو ہاتھ میں لئے آسمان سے گرتے دیکھا ہے یا نہیں؟۔"

دودھ والے کی بیوی ایسے تبصرے سنتی تو آگ بگولہ ہو جاتی اور چلّا کر کہتی "میں تمہاری بکواس نہیں سننا چاہتی۔ تمہیں مذاق اڑانا ہی ہے تو اس موئے کا اڑاؤ جو تمہیں ایسی کہانیاں سناتا ہے۔"

مگر گاؤں کے لوگ باز نہ آتے۔ اور یوں اکثر دودھ والے کی بیوی باہر جا کر غصہ اور اداسی سے بھر کر گھر واپس آتی۔

ایک دن دودھ والا جنگل سے گھر لوٹا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے پاس ایک نئی کہانی تھی۔

"آج میں تمہیں ایک زبردست کہانی سناؤں گا۔ یہ کہانی اس وقت میرے ذہن میں آئی جب میں گائے کا دودھ نکال رہا تھا۔"

"خدا کے لئے مجھے کوئی کہانی وہانی مت سناؤ۔ میں عاجز آ گئی ہوں تمہاری کہانیوں سے۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"کیا معاملہ ہے؟" دودھ والے نے اپنی بیوی کو بگڑتے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا اب تمہیں یہ بھی بتانا ہو گا کہ کیا معاملہ ہے؟" اس کی بیوی نے غصہ سے کہا "معاملہ یہ ہے کہ تم آدمی نہیں بلکہ کہانیوں سے بھرا ایک تھیلا ہو۔ پورا گاؤں تمہاری کہانیوں پر ہنستا ہے مگر تمہیں اس کی رتی بھر پروا نہیں۔ گاؤں کے لوگ مجھے "کہانیاں سنانے والے کی بیوی" کہہ کر پکارتے ہیں۔"

دودھ والا شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ معاملہ ہے۔ مجھے معاف کر دو اور یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں" دودھ والے نے کہا۔

"یہ کرو کہ اپنی تمام کہانیوں کو تھیلے میں بھرو اور کہیں دور پھینک آؤ اور خدا کے لئے مجھے پھر کبھی کوئی کہانی مت سناؤ" اس کی بیوی نے کہا۔

ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ہی صبح کہانیوں کو بوری میں بھر کر جنگل کی طرف چلا جاؤں گا اور انہیں وہاں پھینک دوں گا۔ مگر یاد رکھو کہ جنگل میں بہت سانپ اور آدم خور چیتے ہیں۔ چنانچہ ممکن ہے میں زندہ واپس نہ آسکوں۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تم زندہ آتے ہو یا نہیں، بس خدا کے لئے تم اپنی یہ اول جلول کہانیاں پھینک آؤ" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

اگلی صبح دودھ والے کی بیوی نے جلدی سے اٹھ کر اپنے شوہر کے لئے اچھا سا ناشتہ تیار کیا۔ دودھ والا سورج کے نکلنے سے پہلے ہی جنگل کی طرف جانے والے راستہ پر چل پڑا۔

دودھ والے کی بیوی دن بھر گھر میں بیٹھی اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ سورج ڈھلنے سے ذرا کچھ پہلے اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر واپس آرہا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ اس کی طرف دوڑی۔

"پھینک دیں نا تم نے سب کی سب کہانیاں؟" اس نے اپنے شوہر کے قریب جاتے ہی پوچھا۔

"ارے کہاں مجھے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔ کیونکہ جنگل میں داخل ہوتے ہی میرے ساتھ ایک عجیب بات پیش آئی۔ جیسے ہی میں جنگل میں داخل ہوا ایک چیتا میرے پیچھے لگ لیا۔ میں جتنی تیز بھاگا چیتا اس سے زیادہ تیز بھاگا۔ مگر قبل اسکے کہ وہ مجھے پکڑتا میں ایک کیلے کے درخت پر چڑھ گیا۔ مگر کم بخت وہ چیتا بھی کیلے کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ میں اور اوپر چڑھ گیا مگر وہ بھی اور اوپر آگیا۔ جب ہم بادلوں تک پہنچ گئے تو کیلے کا پیڑ ہلنے لگا اور پھر ایک تڑاخ کے ساتھ وہ درخت گر پڑا۔ اور خوش قسمتی سے چیتا جنگل میں اور میں تمہارے بھائی کی چھت پر گرا۔ اس وقت تمہارے بھائی کی بیوی چاولوں کا کیک بنا رہی تھی۔ چنانچہ یہاں آنے سے قبل اس نے مجھے وہ کیک کھلایا۔ کیا تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں تو تم خود ہی یہ کیک چکھ لو۔"

اگرچہ اس کی بیوی سخت غصہ میں آگئی تھی مگر پھر بھی وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

"میرے خدا! تم بھی کیسے قصہ گو ہو۔ میں نے تمہیں ساری کہانیاں پھینک کر آنے کے لئے جنگل میں بھیجا تھا مگر تم کہانیوں کا ایک اور تھیلا بھر لائے ہو۔"

"اس کی بیوی نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

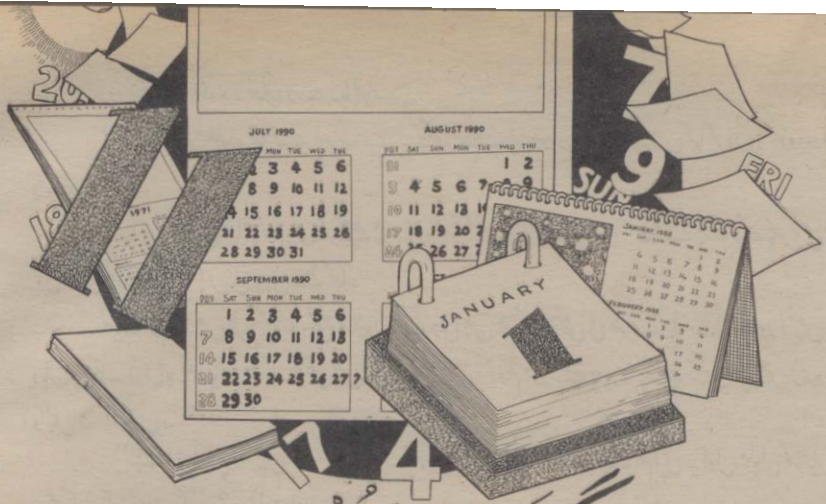

گیارہ دِن کا نُقصان

تاریخِ اہمیّت کے اُن گیارہ دنوں کا احوال جنہوں نے برطانیہ کو پریشان کر دیا

ڈاکٹر ریاض الاسلام

یہ عجیب واقعہ اب سے کوئی دو سال پہلے کے انگلستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانے میں انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی تاریخوں میں گیارہ دن کا فرق رہتا تھا۔ یعنی انگلستان میں جب پہلی تاریخ ہوتی تھی تو اٹلی اور فرانس میں ۱۲ ہوتی، جب انگلستان میں ۲ ہوتی تو، دوسرے ملکوں میں ۱۳ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے بیشتر ملکوں نے اب سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے ایک نیا کیلنڈر اختیار کر لیا تھا۔ اس لئے ان کے یہاں سال مہینہ اور تاریخوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ انگلستان والے ہمیشہ سے پرانی لکیر کے فقیر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے یہاں کیلنڈر نہیں بدلا اور پرانا کیلنڈر ہی قائم رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور دوسرے ممالک کی تاریخوں میں فرق رہنے لگا۔

اس کے سمجھنے کے لئے بہت آسان مثال برصغیر کے کیلنڈروں کی ہے۔ برصغیر میں بہت سے کیلنڈر جاری ہیں۔ ان میں عیسوی، ہجری اور ہندی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تینوں کا حساب الگ الگ ہے اور تینوں کی تاریخ میں فرق رہتا ہے اور یہ فرق گھٹا بڑھتا رہتا ہے۔ ہندی مہینے چاند کے حساب سے ہوتے ہیں۔

عیسوی کیلنڈر میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ سورج کی گردش کے حساب پر مبنی ہے۔ اس لئے موسم ہمیشہ ایک ہی مہینوں میں آتے ہیں۔ دسمبر میں ہمیشہ جاڑا ہوتا ہے اور مئی میں ہمیشہ گرمی پڑتی ہے۔ ہجری یا چاند کے حساب میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ کبھی رمضان شریف گرمیوں میں آتے ہیں اور روزے بڑے ہو جاتے ہیں اور کبھی جاڑوں میں آتے ہیں اور روزے اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ چھوٹے بچے بھی آسانی سے رکھ لیتے ہیں۔ ہندو لوگ بہت ہوشیار ہیں، وہ نہ چاند کو چھوڑنا چاہیں اور نہ سورج کو۔ دونوں دیوتا۔ ان میں سے کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے انہوں نے یہ ترکیب رکھی ہے کہ تاریخیں چاند کے اعتبار سے شمار کرتے ہیں لیکن جب بھی ان کے اور سورج کے (یعنی عیسوی) حساب میں زیادہ فرق پڑ جائے تو لوند کا مہینہ لگا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔

سورج اور چاند کا حساب بتاتے بتاتے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ان سب باتوں کے بتانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ تاریخوں میں فرق پڑ جانے کا معمہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

تو انگلستان اور دوسرے ملکوں کی تاریخوں میں فرق رہتا تھا اور اس فرق سے لین دین کے معاملات اور خط وکتابت میں گھپلا پڑتا تھا۔ اور طرح طرح کی دقتیں پیش آتی تھیں۔ مثلاً کوئی شخص ۲۵ جنوری کو فرانس سے انگلستان روانہ ہوا۔ وہاں دوسرے دن پہنچ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں تو ۱۵ جنوری ہے ان سب دقتوں کو دور کرنے کے لئے انگلستان کے وزیر نے یہ ترکیب سوچی کہ انگلستان بھی وہی کیلنڈر اختیار کرے جو یورپ کے دوسرے ملکوں میں جاری ہے، لیکن اس کے لئے اپنے یہاں کی تاریخوں کا بدلنا ضروری تھا لہٰذا اس وزیر نے ایک مشہور حساب دان مسٹر بریڈلے کی مدد سے ایک نیا قانون تیار کرایا اور پھر اسے پارلیمینٹ میں پاس کرا دیا۔ نئے قانون کی رو سے انگلستان کی تاریخ گیارہ دن آگے بڑھا دی گئی یعنی جس تاریخ کو پہلے حساب کے مطابق ۳ ستمبر ہونا چاہئے تھی، اسے ۱۴ ستمبر کر دیا گیا۔

لیکن لوگ اس قانون سے خوش نہیں ہوئے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تبدیلی سے واقعی ان کا گیارہ دن کا نقصان ہو گیا اور ان کی عمر میں گیارہ دن کم ہو گئے اس کے علاوہ نئے حساب سے تیوہاروں میں بھی فرق پڑ گیا، کیونکہ ہر تیوہار پچھلے حساب کے مقابلے میں گیارہ دن پہلے ہونے لگا لوگ کہتے ہیں کہ تیوہاروں میں اس طرح گڑبڑ کرنا گناہ کی بات ہے۔ اس سے اللہ میاں خفا ہو جائیں گے، عرض نئے قانون کے خلاف کچھ عرصے لوگوں نے خوب شور مچایا۔ جب پارلیمینٹ کے نئے ممبروں کے چناؤ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے امیدوار ممبروں سے مطالبہ کیا کہ ہمارے گیارہ دن واپس دلاؤ۔ کئی سال گزرنے پر جب مسٹر بریڈلے کا بہت دنوں بیمار رہنے کے بعد انتقال ہوا تو بہت سے لوگوں نے کہا کہ اللہ میاں نے انہیں ان کے کئے کی سزا دی۔

چھوڑ گیا

شاہ نواز فاروقی

دادا دوسرے کمرے میں موجود اپنے پوتے کو آواز دیتے ہوئے !

رُکی پڑی ہے گھڑی میاں
لانا میری چھڑی میاں
یہ اکثر رُک جاتی ہے
ٹائم نہیں بتاتی ہے
آج میں اِس سے پوچھ ہی لوں
رُکتی ہے یہ اکثر کیوں؟

پوتا دادا کی آواز سُن کر (خود سے گفتگو کرتے ہوئے)

دادا کو بتلا دوں کیا ؟
آج جو اِس کے ساتھ ہُوا !
پر دادا کب مانیں گے ؟
مجھ کو جھوٹا جانیں گے !

پوتا تخیالی بچوں سے مخاطب ہو کر

آپ مرے ہمجولی ہیں
پڑھتے آنکھ مچولی ہیں
آپ کو میں بتلاتا ہوں
ساری بات سناتا ہوں

ایک لمبا سانس لے کر

آج انوکھی بات ہوئی
دن میں یعنی رات ہوئی
صبح مری جب آنکھ کھلی
میز پہ رکھی گھڑی ہلی
پھر اُس سے یہ آئی صدا
سُنیے میری بات ذرا
اِس گھر میں سب کاہل ہیں
میرے قتل پہ مائل ہیں
مجھ سے کسی کو پیار نہیں
میں اتنا بے کار نہیں!
جب سے یہاں آباد ہوں میں
اُف! کتنا ناشاد ہوں میں
نہیں رہا میں کبھی وہاں
ہوئی نہ میری قدر جہاں
رہوں گا ہرگز یہاں نہیں
چلتا ہوں اب اور کہیں
یہ اُلٹی سیدھی کہہ کر
دھیرے دھیرے سے بہہ کر
پُرزہ پُرزہ توڑ گیا
وقت گھڑی کو چھوڑ گیا

موت کے بعد زندگی

انتخاب: محمد ظفران

موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موت کیا ہے؟ روح کیا ہے اور مرتے وقت انسان پر کیا گزرتی ہے اور مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ ہمارے دین اسلام میں ان باتوں کے جوابات موجود ہیں جن کا آگے کچھ ذکر ہے۔ اس وقت دنیا کے تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک کے بہت سے ڈاکٹر، سائنس دان اور دیگر محققین موت پر تحقیقات کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہزاروں قریب المرگ لوگوں کے تجربات اور بیانات جمع کئے اور ان کی چھان بین اور تجزیہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر ریمنڈ موڈی کی ایک کتاب LIFE AFTER LIFE (حیات بعد حیات) شائع ہوئی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔

عوام الناس کے علاوہ ڈاکٹروں وغیرہ نے بھی اس کتاب میں اور اس کے موضوع میں کافی دلچسپی لی۔ اس کتاب میں ایک سو پچاس قریب المرگ لوگوں کے بیانات و تجربات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان بیانات میں سب سے حیرت انگیز جسم کے بغیر وجود کے احساس کا بیان ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا میں بہت سے مادہ پرست لوگوں کے نزدیک مادی جسم کے بغیر وجود کا تصور ناممکن ہے۔ دوسری بات جو، ان بیانات و تجربات میں بڑی اہم اور حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام افراد نے ایک بڑی تیز روشنی کا تجربہ مختلف طریقوں سے بیان کیا۔ ہر مرنے والے نے اس تیز روشنی کی حرارت تمازت اور شفقت کو محسوس کیا مگر اسے اپنے الفاظ میں

بیان کرنے سے معذوری کا اظہار کیا، البتہ اتنا ضرور بتایا کہ وہ روشن وجود بڑی آسانی سے ان پر محیط ہو گیا۔
شکاگو کی ایک مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر ایلزبتھ کیلر نے آٹھ سالوں میں بڑی محنت اور جانفشانی سے ہزاروں مرتے ہوئے انسانوں کے تجربات قلمبند کئے ہیں اور بتایا کہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سانس اور دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔ لیکن ان کے چہروں جسم اور دیگر نفسیاتی امور کے ذریعے انہوں نے اندازہ لگایا کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش سے باخبر تھے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ انسانی جسم کے تمام اعضاء کسی شخص کے مرنے کے فوراً بعد نہیں مر جاتے بلکہ بعض اعضاء مختلف وقفے تک کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً دماغ دس منٹ، دل بیس منٹ، آنکھیں تیس منٹ، بازو چار گھنٹے، کھال پانچ گھنٹے، ہڈیاں تیس دن، بال اور ناخن مرنے کے بعد نہیں بڑھتے۔ جو شخص آنکھوں کا عطیہ دیتا ہے۔ اسی لئے اس کے لواحقین کے لئے یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ فوری طور پر متعلقہ ادارے کو مطلع کر دیں تاکہ ایک مقررہ وقت کے اندر آنکھیں محفوظ کر لی جائیں۔ مقررہ وقت گزر جانے کے بعد آنکھیں۔ "مردہ" (ضائع) ہو جاتی ہیں اور قابل انتقال نہیں رہتیں۔ اسی طرح نیویارک کے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر کارلس اور سس نے مرنے والوں کے متعلق آٹھ سو ستہتر ڈاکٹروں اور نرسوں کے مشاہدات جمع کئے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ تجربات تو بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی جذباتی کیفیات مشترک ہیں۔ یعنی ایک ناقابل بیان سکون، حسن اور مسرت کا جذبہ۔ بعض مریضوں نے بتایا کہ ذرا سے وقفے میں ان کی زندگی بھر کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ بعض مریضوں کو ایسے لوگوں کی جھلکیاں نظر آئیں جو بہت پہلے مر چکے تھے۔ کئی مریضوں نے دوسری دنیا کے حسین اور دلفریب مناظر دیکھے۔ اس ضمن میں مشہور سائنس دان تھامس ایڈیسن (۱۸۴۷ء تا ۱۹۳۱ء) کے انتقال کا واقعہ قابل ذکر ہے، وہ اپنے خاندان کو ایک الجھن میں چھوڑ کر مرا۔ اس کے متعلق بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کو ماننے والا تھا۔ جب ایڈیسن مرنے لگا تو اس کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اب ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ گہری نیند سویا ہوا ہے اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا، کمرے پر مکمل طور پر خاموشی طاری تھی، اچانک ایڈیسن کسی مدد کے بغیر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا، اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور کئی سیکنڈ تک سامنے کی دیوار کو گھورتا رہا پھر وہ اپنی بیوی کی طرف مڑا اور کہا! "میں حیران ہوں کہ وہاں کتنا خوبصورت منظر ہے۔" اس نے کیا چیز دیکھی تھی؟ ایڈیسن نے یہ نہیں بتایا اور یقیناً کوئی شخص نہیں بتا سکتا۔ ایک اور واقعہ ہنری وارڈ بیچر کا ہے جو اپنے زمانے کا مشہور خطیب تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطبے دیئے تھے۔ وہ لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تمہیں اپنے اعمالوں کی سزا بھگتنے کے لئے ابھی سے تیار ہو جانا چاہئے۔ وہ بہت دردناک لہجے میں حیات اور مابعد حیات کے حالات بیان کرتا تھا۔ جب ہنری بیچر خود مرنے لگا تو اس نے طبیب کو اپنے سرہانے بلا کر کرخت آواز میں سرگوشی کی۔۔ ڈاکٹر!

دوسری دنیا کا راز تو اب کھلا ہے۔" بیچر پر کیا راز کھلا تھا یہ اس نے نہیں بتایا۔ لیکن اس کے بیان سے پراسراریت اور بڑھ گئی۔ ایک اور ماہر نفسیات ڈاکٹر رسل جو آیوا یونیورسٹی میں تعینات ہیں، نے بھی ایک سو پچاس سے زائد لوگوں کے بیانات اور تجربات جمع کئے ہیں جو موت سے قریب تر تھے۔ ڈاکٹر رسل موت کے بعد بقاء کو ناممکن تصور نہیں کرتے اور اپنی تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔ ستمبر ۱۹۷۸ء میں آسٹریلیا کے ایک چھوٹے سے شہر نسبرک میں دنیا بھر کے ایک ہزار چوٹی کے نفسیات دان، علماء، سائنس دان، ڈاکٹر اور ماہرین دینیات جمع ہوئے اور "حیات بعد موت" کے موضوع پر ایک ہفتے تک بحث مباحثے جاری رہے۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ نزع کے عالم میں انسان جن مناظر سے یکایک دوچار ہوتا ہے ان کی اصلیت کیا ہے؟ ظاہری موت کے بعد جن لوگوں کو طبّی امداد سے زندہ کر لیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے بیانات کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ ان سب کے بیانات میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے! ان سب کو مرنے کے بعد (حالانکہ مرنے کا وقفہ بہت قلیل تھا) یکساں تجربات سے گزرنا پڑا۔ انبرک کی ہفت روزہ کانفرنس کے بعد اس کے ترجمان نے اعلان کیا کہ ان تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے سائنس دانوں اور علماء کو یقین ہو گیا ہے کہ زندگی کا خاتمہ قبر پر نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد بھی زندگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ممتاز عالم نفسیات ڈاکٹر اینڈریز بیچ نے اعتراف کیا کہ کانفرنس کے بعض شرکاء ان تحقیقات سے مطمئن نہیں۔ انہیں اب تک موت کے بعد زندگی کا تصور ڈھکوسلا نظر آتا ہے۔ البتہ سائنس دانوں کی اکثریت زندگی بعد مرگ کے امکان کو تسلیم کرنے لگی ہے، ڈاکٹر کارلس اوسز نے اس قسم کے ایک ہزار معاملات کی چھان بین کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر موت کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور ڈاکٹروں نے ان کی طبّی موت CLINICAL DEATH کی تصدیق کر دی تھی۔ مگر بعد میں ان کے تن مردہ میں جان دوڑ گئی۔ سوال کیا گیا کہ موت کی حالت طاری ہونے کے بعد انہوں نے کیا دیکھا؟ اور کیا محسوس کیا؟ سب کا بیان یہ تھا کہ موت کے بعد انہوں نے نجات مطلق کی دلنواز اور فرحت انگیز کیفیت محسوس کی۔ اس عالم میں اپنے مرحوم عزیزوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے لئے سعادتوں کے مژدے اور بشارتوں کے وعدے لائے ہیں۔ اس اجتماع میں سوئیٹزرلینڈ کے ماہر تعمیرات STEFAN JANKOVICH نے اپنے تجربات بیان کئے یہ صاحب سڑک کے ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے اور ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ مگر ان کی زندگی باقی تھی۔ بچ گئے اس لئے ان صاحب نے اعتراف کیا کہ قید جسم سے آزاد ہو جانے کے بعد انہوں نے عجب روحانی بشاشت محسوس کی۔ بعض نفسیات دانوں کا بیان ہے کہ نزع میں مختلف افراد کو جو مناظر نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان کے مذہبی عقائد اور سماجی روایات کا عکس ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہندوستان اور امریکا کے ان افراد سے انٹرویو لئے گئے جو "مر" کر جی اٹھے تھے۔ یہ لوگ مختلف

عقائد اور سماجی ماحول سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم حیرت یہ ہے کہ اپنے دم آخر ان سب نے ایک ہی قسم کی کیفیتیں محسوس کیں۔ ان سب نے ایک تیز چمک دار روشنی دیکھی اور پھر اپنے آپ کو مسرت جاودانی کے دریا میں غرق پایا۔ بہت سے مرنے والوں نے اپنے مرحوم رشتہ داروں سے ملاقات کی۔ انہوں نے کہا کہ سلامتی ہو تم پر! ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ بعض عیسائیوں نے بیان کیا کہ اس عالم میں خود حضرت عیسیٰؑ کی زیارت کی۔ ڈاکٹر اوسزامریکن سوسائٹی فار سائیکیکل ریسرچ کے سربراہ ہیں۔ ان تمام تحقیقات کی نگرانی کے فرائض انہوں نے انجام دیئے ہیں۔ اس کانفرنس کے ایک مندوب جان کوچ نے بتایا کہ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے جسم سے باہر نکل گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر میری جان بچانے یعنی مجھے دوبارہ "زندہ" کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں جسمانی طور پر مر گیا ہوں تو مجھے لافانی سعادت کا احساس ہوا۔ لیکن جونہی ڈاکٹروں کی کوشش سے مجھے اپنے خاکی جسم میں لوٹنا پڑا تو بے حد تکلیف اور درد محسوس ہوا۔ ڈاکٹر ریچ کا بیان ہے کہ انسبرک کے اس اجتماع میں ایک ہزار اہل علم، طب و نفسیات کے ماہرین جمع ہوئے تھے۔ بعض نے "مر" کر جی اٹھنے والوں کے ان بیانات کو مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ "حیات بعد موت" کے ثبوت کے لئے زیادہ مستحکم ناقابل تردید شہادتیں پیش کی جائیں۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ روحانیات تو روحانیات ہم طبیعات (فزکس) میں بھی ان چیزوں پر یقین کرنے پر مجبور ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ مثلاً ایٹم! کیا کسی نے ایٹم کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے البتہ مجموعی اور مربوط شہادتوں سے ایٹم کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ چند سائنس دانوں نے ان واقعات کو توجیہ اس طرح کی ہے کہ نزع کے عالم میں بیمار کو جو خواب آور دوائیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً مارفین! ان کے سبب یہ صورت حال پیش آتی ہے۔ کچھ ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ جانکنی کی حالت میں دماغ میں آکسیجن کا قحط پڑ جاتا ہے اور یہ عجائبات پیش آتے ہیں۔ انسبرک کی یہ کانفرنس "امیج آف دی ورلڈ" آرگنائزیشن کے تحت منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے مباحثے کا نچوڑ یہ ہے کہ "حیات بعد موت" کا موضوع مزید تحقیقات کا مستحق اور محتاج ہے اور اب صرف اتنی بات رہ گئی ہے کہ اس غیر نفسیاتی مظہر (زندگی بعد مرگ) کی سائنسی تصدیق کے وسائل فراہم کئے جائیں۔ یہ ہے یورپ اور امریکہ کے سائنس دانوں اور علمائے نفسیات کے نظریات کا خلاصہ۔ بہرحال تحقیقات اور کوشش کے باوجود بھی دنیا کا کوئی سائنس دان ماہر نفسیات، محقق، کلی طور پر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آخر موت کیا ہے۔ نزع کا عالم کیسا ہوتا ہے؟ یہ تو ایک سربستہ راز ہے جس سے وہی واقف ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ ہی واقفِ حیات و موت ہے۔ آنحضرتؐ سے روح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "روح اللہ کا حکم ہے"۔ موت کے بعد انسان ایک دوسرے جہاں میں پہنچ جاتا ہے جس کو "عالم برزخ" کہتے ہیں۔ وہاں کے پورے حالات کا اس جہان میں سمجھنا ممکن نہیں اس لئے نہ تو تمام کیفیات بتائی گئی ہیں اور نہ انسان ان کو معلوم کر سکتا ہے۔

ایک پارٹی

جووقاص کو مہنگی پڑی

سیّد کاشان جعفری

وقاص بڑی الجھن میں مبتلا تھا۔ اور دل ہی دل میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک دلدل میں دھنستا چلا جارہا ہے۔

چار ماہ ہوگئے تھے اسے اس جنجال میں پھنسے ہوئے..... کئی بار اس کے جی میں آیا کہ وہ امی، یا ابو کو سب کچھ صاف صاف بتادے۔ مگر پھر شیطان اسے وسوسے میں ڈال دیتا۔ کہیں امی اور ابو اس کی بات سن کر سخت سی سزا نہ سنادیں۔ اس کے ابو تو اصولوں کے بہت ہی پابند آدمی تھے۔ خاندان بھر میں وہ اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے پر مشہور تھے۔ یہ سوچ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ اور سچ بولنے کا ارادہ ریت کی دیوار کی طرح بکھر کر رہ جاتا۔

اس دن مہینے کی پہلی تاریخ تھی، شام کے وقت ابو نے معمول کے مطابق پچاس روپے جیب خرچ اس کے حوالے کر دیا۔ چند ماہ پہلے تک اسے جیب خرچ لے کر کس قدر خوشی ہوا کرتی تھی۔ وہ اس رقم سے اپنے پچاس کام نکالتا تھا۔ اپنی ضروریات پوری کرتا تھا۔ مگر گزشتہ چار ماہ سے..... سوچتے، سوچتے اس کی پلکوں پر آنسو تیرنے لگے۔

جیسے ہی وہ جیب خرچ کی رقم لے کر اپنے کمرے میں پہنچا ویسے ہی دبے پاؤں چچا شبو بھی وہاں آ گئے۔ اور اپنا بڑا سا ہاتھ وقاص کے آگے پھیلا دیا۔ وقاص ان کا پھیلا ہوا ہاتھ دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا، اس کا حلق خشک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بے جان سے محسوس ہونے لگے..... دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں خاموش..... اور صرف آنکھیں ہی ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وقاص نے بڑی خاموشی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا اور مہینے بھر کا جیب خرچ اس کے ہاتھ سے نکل کر چچا شبو کی ہتھیلی میں سما گیا۔

حد ہو گئی..... ذلالت کی..... حالاں کہ ان ہی چچا شبو کی آغوش میں پل کر تو وہ بڑا ہوا تھا..... اور چچا شبو نے ہی تو اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ مگر اب یہ ذلت آمیز سلوک..... وقاص کے دل میں آیا کہ وہ زور، زور سے چیخ کر چچا شبو سے کہے کہ آپ دوست نہیں، میرے دشمن ہیں..... آپ لالچی اور بلیک میلر ہیں۔ آپ جس تھالی میں کھاتے ہیں، اسی میں چھید کر رہے ہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہ کہہ سکا..... کہتا بھی تو کیسے..... وقاص کی جان تو چچا شبو کی قید میں تھی..... وہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔

"کیوں، وقاص میاں کیا سوچنے لگے..... بڑے ناراض سے معلوم ہوتے ہیں آپ مجھ سے۔" چچا شبو نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آپ کا یہ سلوک اور کب تک جاری رہے گا" وقاص نے رندھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"جب تک میرا دل چاہے گا۔ چچا شبو جواب دے کر دھیرے سے مسکرائے۔"

"آپ کو شرم نہیں آتی، مجھ سے اس طرح ہر ماہ زبردستی رقم اینٹھتے ہوئے..... جی چاہتا ہے کہ ابو سے آپ کی شکایت کر دوں....." اس نے دھیرے سے مگر دانت پیستے ہوئے کہا..... "آپ کی اس حرکت کا سن کر ابو ملازمت سے فوراً ہی نکال دیں گے آپ کو....."

"نہیں..... نہیں..... وقاص میاں آپ اس کی زحمت کیوں کریں..... آپ اجازت دیں تو یہ خدمت میں ہی بجالاؤں..... کہئے کب کر دوں آپ کا یہ کام، آج یا کل....." اور اس کے ساتھ ہی وقاص کا دیا ہوا نوٹ واپس اسی کی طرف لوٹا دینے کے لئے بڑھا دیا۔

وقاص یہ سنتے ہی بُری طرح گھبرا گیا۔ ابو جان کو اگر اس بات کا علم ہو گیا تو پھر سمجھو اس کی خیر نہیں۔ وہ تو ایک منٹ بھی اسے گھر میں رکھنے کے روادار نہ ہوں گے۔ اور کھڑے کھڑے اسے باہر نکال دیں گے۔ وہ کچھ بولے بغیر خاموشی سے منہ پھیر کر اپنی میز کے سامنے کتاب کھول کر بیٹھ گیا..... اور اسے خاموش

لاجواب دیکھ کر چچا شبو نوٹ کو جیب میں رکھتے ہوئے اس کے کمرے سے باہر نکل گئے.....

وقاص کو تنہائی میں ذرا سکون ملا تو اس کے ذہن کے پردے پر گزرے ہوئے دنوں کی یادیں گردش کرنے لگیں..... سچ تو یہ ہے کہ اسے جو جیب خرچ ملتا تھا وہ اس کی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ بلکہ وہ پہلے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچا کر جمع بھی کر لیا کرتا تھا۔ مگر پھر اسلم کے ساتھ دوستی ہو جانے سے اسے یہ دن دیکھنا پڑا۔ اسلم ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا فضول خرچ لڑکا تھا..... اسے جتنے پیسوں کی بھی ضرورت ہوتی وہ اپنے گھر سے لے آتا اور اسکول کے ساتھیوں پر بڑی فیاضی سے خرچ کرتا۔ اسلم سے دوستی ہو جانے کے بعد اس گروپ میں شامل جاوید اور کامران بھی اس کے دوست بن گئے۔ جاوید اور کامران بھی ہاتھ کھول کر خرچ کرنے میں بڑے ماہر تھے۔

اس دن وقاص کی سالگرہ تھی..... اسلم، جاوید اور کامران کو اس کی سالگرہ کی تاریخ معلوم تھی..... تینوں اس کے سر ہو گئے کہ بھئی آج کی پارٹی تو وقاص کی طرف سے ہوگی..... اور کیفے کہکشاں میں.....

وقاص یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ کیفے کہکشاں کوئی معمولی کیفے نہیں تھا۔ اس میں کئی بار وہ اسلم، جاوید اور کامران کی دعوت پر چائے، لنچ اور ناشتے کے لئے آچکا تھا۔ اور چار لڑکوں کے کھانے کا بل دو سو روپے سے کبھی کم نہیں بنا تھا۔

اور اس وقت اس کی جیب میں صرف ۲۵ روپے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں کو ٹالنا چاہا، مگر وہ کہاں ٹلنے والے تھے۔ وقاص نے کہا بھی کہ میرے پاس صرف ۲۵ روپے ہیں۔ اسی جواب پر کامران چہک کر بولا ..... "دیکھو بھائی وقاص..... پیسے نہیں ہیں تو چلو بل کی ادائیگی ہم کر دیں گے..... میری یہ رقم تم پر ادھار رہے گی۔ آج تمہاری سالگرہ کا دن ہے، دعوت آج ہی مزا دے گی۔ کل کیا مزا آئے گا"..... وقاص نے سوچا دوست ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں پیسوں کی ادائیگی کا مسئلہ بھی انہوں نے خود ہی حل کر دیا ہے..... میرے پاس جو پیسے جمع ہیں وہ میں کل لا کر انہیں دے دوں گا..... بس یہی سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

چاروں ساتھی آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے کیفے کہکشاں پہنچ گئے۔

جب ان کا پیٹ تمام چیزوں سے اچھی طرح بھر گیا تب بیرے نے آکر خالی برتن سمیٹے، اور پھر بل لے آیا۔ وقاص نے دیکھا ساڑھے تین سو روپے کا بل تھا..... بل دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا "یہ تو بہت زیادہ ہے۔"

گھر پہنچنے کے بعد وقاص نے سب سے پہلے گلک سے سارے نوٹ نکال کر گنے تو وہ صرف ڈیڑھ سو روپے ہی نکلے..... بل تو ساڑھے تین سو روپے کا تھا..... باقی دو سو روپے کہاں سے آئیں گے..... یہ سوچ کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ابو سے مانگنے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ قرض اور ادھار کو سخت ناپسند کرتے

تھے وہ کہتے ، فضول خرچ انسان کبھی خوش نہیں رہتا ، اسے کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا" ..... اس کے ابو ایک اکاؤنٹنٹ تھے۔ وہ یہ بھی کہتے کہ آمدنی کے پانچ حروف ہیں ، ا ، م ، د ، ن ، ی ..... اور خرچ کے تین حروف ، خ ، ر ، چ ..... بس ، اگر آمدنی ۵ روپے ہے تو خرچ تین روپے ہونا چاہئے .....

پھر بھائی جان کا خیال آیا ، مگر وہ بھی وکیلوں کی طرح جرح شروع کر دیں گے۔ امی تو سرے سے بچوں کو پیسہ دینے کی قائل ہی نہیں ہیں اور باجی ..... وہ تو اپنے جیب خرچ کو بچا بچا کر اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ ان کے پاس بچت کا تو سوال ہی نہیں۔ پھر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات دیر تک وہ جاگتا رہا ، اور اپنے دوستوں کو کیفے کے بل کی ادائیگی کے سوال پر غور کرتا رہا۔ سوچتے ، سوچتے آخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

صبح ہوئی ..... ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے اسکول جانے کے لئے اپنا بستہ تیار کیا۔ گھر کے اسٹور میں ایک شوکیس میں چاندی کے برتنوں کا ایک سیٹ رکھا ہوا تھا ..... یہ سیٹ اس کے نانا نے اپنی بیٹی ، یعنی وقاص کی ماں کو تحفے میں دیا تھا۔ اور یہ بطور یادگار شوکیس میں ہی رکھا رہتا تھا۔ اسے کبھی استعمال کے لئے نہیں نکالا گیا ..... وقاص نے ان برتنوں میں سے چاندی کی ایک سب سے چھوٹی ڈش جو رائتے یا میٹھے کے لئے استعمال کے قابل تھی نکال کر اپنے بستے میں چھپالی ..... اور اسکول جاتے ہوئے راستے میں ایک برتن فروش کے ہاتھ وہ چاندی کی ڈش دو سو روپے کے بدلے میں فروخت کر دی۔ اور اسکول پہنچ کر وعدے کے مطابق جاوید کی رقم واپس کر کے وہ دوستوں میں سرخرو ہو گیا .....

پہلی تاریخ کو جب وہ ابو سے جیب خرچ کی رقم لے کر اپنے کمرے میں پہنچا تو چچا شبو پہلے سے موجود تھے ..... اسے کمرے میں آتے دیکھ کر بولے ، "وقاص میاں ، لائیے اپنا سارا جیب خرچ مجھے دیدیجئے ....."

"کیوں .....؟" وقاص نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ آپ نے شوکیس میں سے چاندی کی چھوٹی ڈش نکال کر کہاں بیچی ہے۔ اور ان پیسوں کا کیا کیا ہے۔" چچا شبو نے جواب میں کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں .....؟" چچا شبو ..... وقاص نے غصے میں کہا۔ "وقاص میاں ، میں نے جو کچھ کہا ہے ، آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں غصے کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اور وقاص ان کے لہجے کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے بالکل ہی خاموش ہو گیا۔ وہ ڈر گیا کہ اس کی چوری کا علم ابو کو ہو گیا تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ بس تب ہی سے ہر ماہ اس کا جیب خرچ بڑی خاموشی اور راز داری کے ساتھ چچا شبو کی جیب میں پہنچ رہا تھا۔

اس دن کلاس میں حساب کے ٹیچر سب کی کاپیاں چیک کر رہے تھے۔ رشید سر نے ارشد کو اپنی جگہ کھڑا ہو جانے کا حکم دے کر پوچھا، "ارشد میاں، آپ نے ہوم ورک نہیں کیا، ان کاپیوں میں آپ کی کاپی نہیں ہے....."

ارشد نے کہا..... "سر، میں نے ہوم ورک نہیں کیا اور میں جھوٹا بہانہ قطعی نہیں بناؤں گا۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی غلطی دوبارہ نہیں ہوگی۔"

رشید سر نے ارشد کی بات توجہ سے سنی اور پھر اس کے قریب پہنچ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ارشد میاں..... آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔ یہ بہت کافی ہے اور مجھے آپ کے سچ پر بھی فخر ہے۔ اسی سچ کی وجہ سے اب آپ کو کوئی سزا نہیں ملے گی۔"

وقاص بھی کلاس میں موجود تھا، ارشد اور رشید سر میں ہونے والی باتوں نے اس پر بڑا اثر کیا، اس کا ذہن ایک دم روشن ہو گیا، وہ سوچنے لگا ایک برائی کو چھپانے کے لئے یا ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے کتنے اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

شام کو چائے کی میز پر سب چسکیاں لیتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے، تب ہی موقع مناسب سمجھ کر وقاص نے ابو جان کو مخاطب کیا، اور پھر اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے ساری بات انہیں تفصیل سے بتادی۔

ابو جان بہت خوش ہوئے، انہوں نے مسکرا کر کہا بیٹے، "مجھے خوشی ہے کہ تم جھوٹ اور چوری کی دلدل سے آزاد ہو گئے....."

ابو جان.....! "اب آپ چچا شبو کو ان کی ملازمت سے آج ہی برطرف کر دیں۔ یہ اس گھر کے دوست نہیں دشمن ہیں..... وہ ہر مہینے بڑی پابندی کے ساتھ مجھ سے پچاس روپے وصول کرتے رہے۔ یہ روپیہ بھی ان کی تنخواہ سے کاٹ لیجئے گا۔"

وقاص کی بات جیسے ہی ختم ہوئی چچا شبو بھی وہاں مسکراتے ہوئے پہنچ گئے..... ان کے دونوں ہاتھ پیچھے تھے۔ پھر ایک ہاتھ آگے لا کر انہوں نے کوئی چیز میز پر رکھ دی..... وقاص نے دیکھا یہ وہی چاندی کی ڈش تھی جسے وہ چار ماہ قبل گھر سے چرا کر فروخت کر آیا تھا۔

چچا شبو نے مسکراتے ہوئے کہا، وقاص میاں میں نے جو آپ سے پیسے لئے وہی جمع کر کے دکاندار سے گھر کی چیز واپس لے آیا ہوں۔ مجھے دکھ تھا کہ ہزار روپیہ کی چیز آپ دو سو روپے میں بیچ آئے تھے..... اگر میں ایسا نہ کرتا تو یہ چیز گھر میں واپس نہ آتی اور نہ ہی آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔

وقاص حیرت سے منہ کھولے چچا شبو کو دیکھ رہا تھا جو اپنی بات کہہ کر مسکرائے جا رہے تھے۔

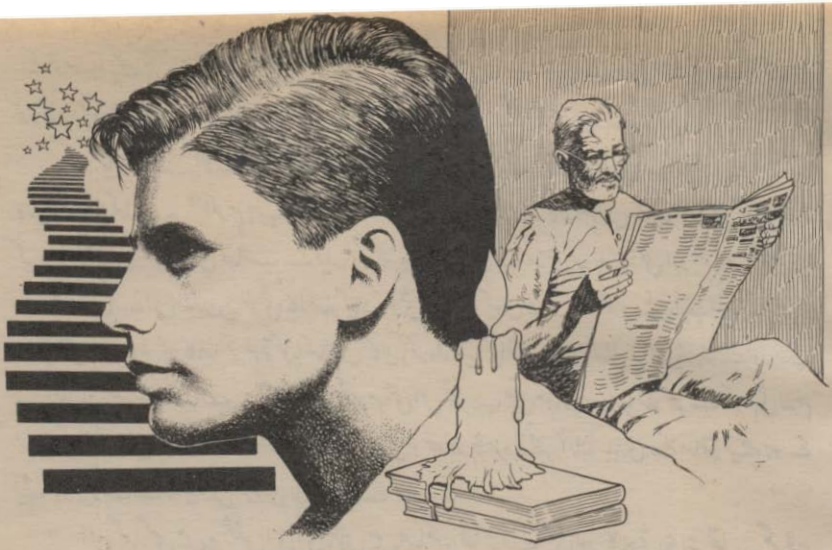

ماسٹر جی

سلیم مغل

سچی کہانی جس کے سب کردار آج بھی زندہ ہیں

یہ کوئی بہت بڑی دعوت نہ تھی لیکن چھوٹے سے قصبے میں اتنی گہما گہمی پر بھی کسی بڑی دعوت کا گمان ہو رہا تھا۔ دعوت کا ہر شریک بہت خوش تھا، اور خوش کیوں نہ ہوتا..... ماسٹر جی کے لڑکے اکرم نے مقابلے کا امتحان جو پاس کر لیا تھا۔ کہاں تو یہ کہ گاؤں سے کوئی دسویں جماعت تک پاس نہ کرتا تھا اور کہاں یہ کہ ماسٹر جی کے بیٹے نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا اور وہ بھی اس اعزاز کے ساتھ کہ ملک بھر میں اس کی پہلی پوزیشن آئی۔ یہ اعزاز صرف اکرم یا ماسٹر جی کے لئے ہی تو نہیں تھا بلکہ پورا گاؤں ہی اس خبر کو اپنے لئے باعث عزت سمجھ رہا تھا..... گاؤں کے لوگ ماسٹر جی کو تو مبارک باد دے ہی رہے تھے مگر وہ ایک دوسرے سے بھی بغل گیر ہوتے ہوئے بھی گرمجوشی کا اظہار کرتے..... لالہ بشیر نے نمبردار نذیر کے کندھے پر گرمجوشی سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا..... "بھئی اپنے اکو نے تو کمال ہی کر دیا۔" "کمال کیوں نہ کرتا"..... نمبردار نے جواب دیا..... "آخر ماسٹر جی کا بیٹا ہے پوری زندگی انہوں نے اس کو بڑا آدمی بنانے

کے خواب دیکھے ہیں۔" ..... "ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں..... ماسٹر جی نے بڑی محنت کی ہے۔" لالہ بشیر اور نذیر نمبردار باتیں کرتے ہوئے ماسٹر جی کی طرف بڑھے اور گلے لگا کر مبارک باد دی.....

"ماسٹر جی..... اکو نے ہمارا شملہ اونچا کر دیا ہے۔" قصبے کے بڑے چوہدری نے ماسٹر جی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا..... "اکرم جب اسسٹنٹ کمشنر بن کر گاؤں آئے گا تو ہم اس کا ایسا استقبال کریں گے کہ دنیا دیکھے گی۔" چوہدری صاحب نے ایک بار پھر بڑے عزم کے ساتھ یہ بات کہی اور اطراف کھڑے ہوئے لوگوں نے اس اعلان پر خوشی کا اظہار کیا۔ خوشی کا اظہار کیوں نہ کرتے گاؤں میں ایک انہونی بات جو ہو گئی تھی..... ماسٹر جی کا بیٹا اکرم تو گویا کہانیوں کا ایسا کردار بن گیا تھا جو پوری کہانی پر چھایا رہتا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کرتا ہے..... "کاش آج اکرم بھی اس تقریب میں موجود ہوتا" بابا شاہ محمد نے اکرم کی عدم موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے کہا..... "ہاں واقعی دعوت کا مزہ تو پھر آتا۔" باباجی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اور بزرگ نے تائید میں گردن ہلاتے ہوئے کہا.....

اس گہما گہمی میں ہر شخص اپنی اپنی باتوں میں ایسا مگن تھا کہ اسے کسی اور کا ہوش ہی نہ تھا..... مگر ان سب لوگوں کے بیچوں بیچ بیٹھے ہوئے حافظ جی کے لڑکے رؤف کو ایک بات بڑی دیر سے پریشان کر رہی تھی..... رؤف سے رہا نہ گیا اور اس نے بالآخر عبدالسلام سے کہہ ہی دیا "عبدالسلام تم ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہے ہو۔" "ہاں دیکھ رہا ہوں..... یہ خوشی کے آنسو ہیں..... شائد ماسٹر جی سے یہ خوشی ضبط نہیں ہو رہی" ..... عبدالسلام نے جواباً کہا..... عبدالسلام کا جواب بھی رؤف کو مطمئن نہ کر سکا..... اس نے انکار میں گردن ہلائی اور کہا..... "عبدالسلام یہ آنسو خوشی کے نہیں ہو سکتے..... آنسو خوشی کے ہوں تو چہرہ کبھی نہیں مرجھاتا..... بات کچھ اور ہے اور بات بھی کوئی معمولی نہیں ہے۔" رؤف نے اپنی تشویش کا اظہار کیا.....

"تُو تو سدا کا وہمی ہے۔" عبدالسلام نے رؤف کو گھورتے ہوئے کہا اور خود دوسری جانب چل دیا.....

رؤف اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے ٹکٹکی باندھ کر ماسٹر جی کو دیکھتا رہا..... ماسٹر جی سب سے مل رہے تھے باتیں بھی کر رہے تھے۔ مبارک باد بھی وصول کر رہے تھے، مگر ان کا چہرہ خوشی کی اس چمک سے عاری تھا جس کی کرنیں دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہیں..... رؤف کو یقین ہو گیا کہ بات کچھ ضرور ہے..... بات تو واقعی کچھ تھی بھی مگر اس بات کو ماسٹر جی کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا.....

اکرم کی کامیابیوں کے سلسلے میں ہونے والی یہ دعوت بالآخر اختتام کو پہنچی..... لوگ ماسٹر جی سے گلے مل مل کر رخصت ہوتے رہے..... حافظ جی کے بیٹے رؤف نے گلے ملتے ہوئے ماسٹر جی سے کہا.....

"ماسٹر جی کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟" "نہیں بیٹا نہیں..... بالکل نہیں" ماسٹر جی نے اپنے اندر کے کرب کو چھپاتے ہوئے کہا یوں بات آئی گئی ہو گئی.....

مہمانوں سے فارغ ہو کر ماسٹر جی بوجھل قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور آکر چارپائی پر دراز ہو گئے.....

ماسٹر جی کی خدمت گزار بیوی نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ تھک گئے ہیں تو وہ چپکے سے آئیں اور آکر ماسٹر جی کے پاؤں دبانے لگ گئیں.....

"بہت تھک گئے ہیں کیا؟"..... ماسٹر جی کی بیوی نے پوچھا.....

"تھک نہیں گیا..... ٹوٹ گیا ہوں....." ماسٹر جی نے جواباً کہا۔

"ہائے ہائے اللہ خیر کرے ایسی کیا بات ہو گئی"....؟

ماسٹر جی کی بیوی کا اضطراب ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ ماسٹر جی بہت دیر تک کچھ نہ بولے پھر کہنے لگے.....

"نیک بختے..... تجھے یاد ہے ہم لوگوں نے اکّو کے بچپن میں اس کی خاطر کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں؟"

"ہاں ..... مگر اس میں کون سی انوکھی بات ہے وہ تو سب ہی والدین اٹھاتے ہیں۔" ماسٹر جی کی بیوی بولیں۔

"اور تجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب وہ بیمار ہو گیا تھا تو ہم نے اپنی عبادتوں کے واسطے دے کر اللہ سے اس کی صحت اور زندگی چاہی تھی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے ہم رات رات بھر اس کی خاطر نفل پڑھا کرتے تھے....."

"اور تجھے یہ بات بھی یاد ہے کہ ہم نے کتنے پہر بھوکے رہ کر اسے بھوکا رہنے سے بچایا تھا"

"ہاں مجھے یہ باتیں بھی یاد ہیں مگر یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟"

"پہلے میری بات سن لو بعد میں سوال کرنا....." ماسٹر جی نے رندھی ہوئی آواز میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"کہیئے کہیئے آپ کیا کہتے ہیں؟"..... ماسٹر جی کی بیوی نے پریشان اور مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اس کی تعلیم کی خاطر کیا کیا جتن نہیں کئے۔"

"کیوں نہیں معلوم..... کسے نہیں معلوم.....؟ آپ نے تو اپنی زندگی ہی اکّو کی تعلیم کے لئے وقف

کر دی تھی۔ مجھ سے زیادہ اور کون واقف ہو گا..... آپ تو سجدوں میں گر کر اس کی اچھی تعلیم کی دعائیں مانگتے تھے.....۔" ماسٹر جی کی بیوی نے ماسٹر جی کی تائید میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔

"سچ سچ بتانا کہ تم اور ہم حج پر کیوں نہیں جا سکے تھے؟ سچ کہنا اکو کی اماں بالکل سچ کہنا....." ماسٹر جی نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا.....

"ہم حج پر کیسے جا سکتے تھے۔ جو چار پیسے جوڑتے وہ اکو کی تعلیم پر خرچ ہو جاتے..... ہمیں تو قرض بھی اٹھانے پڑے تھے..... مقروض لوگ حج کیسے کر سکتے ہیں؟"

ماسٹر جی کی صابر و شاکر بیوی ہر بات کا جواب بڑے تحمل سے دے رہی تھیں مگر وہ اب تک یہ بات سمجھنے سے قاصر تھیں کہ ماسٹر جی یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں.....

آخر کار ماسٹر جی نے ایک اخبار کھول کر اپنی بیوی کے سامنے رکھ دیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے کہنے لگے.....

"یہ صلہ دیا ہے تمہاری نیک بخت اولاد نے ہمیں، ہماری محبتوں کا.....

اس دن کے لئے ہم نے پالا تھا اسے..... یہ انعام ہے ہماری دعاؤں اور ہماری عبادتوں کا.....؟"

ماسٹر جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے..... اور ماسٹر جی کی بیوی کی نظریں اکرم کے اس انٹرویو پر جم گئیں جو مقابلے میں اس کی پہلی پوزیشن آنے پر اخبار میں شائع ہوا تھا..... ایک بڑی سی تصویر کے ساتھ وہ اخبار کے صفحے پر سب سے زیادہ نمایاں تھا.....

انٹرویو کی سرخی تھی۔

"یہ مقام میں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔"

سی ایس ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے اکرم علی سے انٹرویو۔

ماسٹر جی کی بیوی انٹرویو پڑھتی گئیں اور ان کا چہرہ حیرت کی تصویر بنتا چلا گیا.....

سوال..... آپ کے حلقہ احباب میں آپ کا آئیڈیل۔

جواب..... ہاں میری ایک یونیورسٹی ٹیچر نے مجھے بہت متاثر کیا.....

سوال..... آپ اپنے گاؤں واپس جا کر وہاں کے لوگوں کی خدمت کرنا پسند کریں گے؟

جواب..... ساری عمر گاؤں کا عذاب سہا ہے..... خدارا اب تو گاؤں کی بات نہ کیجئے۔

سوال..... گاؤں میں آپ کا کوئی ایسا دوست جس سے آپ کی یادیں وابستہ ہوں؟

جواب..... گاؤں میں تو کوئی نہیں البتہ یونیورسٹی میں میرا ایک روم پارٹنر تھا اس کے والد آج کل

سفیر ہیں وہ دوست مجھے زندگی کے کسی موڑ پر بھی نہیں بھولے گا۔

سوال ..... آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟

جواب ..... وہ فوج کے ریٹائرڈ افسر ہیں۔

سوال ..... کیا آپ کی کامیابی میں آپ کے والدین کی کوششوں کا عمل دخل بھی ہے؟

جواب ..... بہت زیادہ نہیں..... کیونکہ مجھے ہی شوق نہ ہوتا تو وہ کیا کر لیتے۔

اس سے زیادہ وہ اور کیا پڑھتیں ..... انٹرویو میں سبھی کچھ تھا، دوستوں کا ذکر، ٹیچرز کی باتیں یونیورسٹی کے تذکرے بس اگر کچھ نہیں تھا تو ان بوڑھے ماں باپ کا ذکر جنہوں نے پوری زندگی اکرم کو بڑا آدمی بنانے کے خواب دیکھے اور اس خواب کی تعبیر پانے کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیا.....

اکو کی محبت کرنے والی ماں کی آنکھوں سے دو آنسو گرے اور اخبار میں جذب ہو گئے۔

.....

سنا ہے اکرم آج کل کہیں ڈپٹی کمشنر ہے..... اس کے دوستوں اور ملنے والوں کا بڑا حلقہ ہے..... وہ کسی بڑے سے شہر کے پررونق کوٹھی میں رہتا ہے..... اسے اب گاؤں کے کچے راستے اچھے نہیں لگتے۔

مگر گاؤں کے ایک کچے اور بوسیدہ سے گھر میں ایک ادھیڑ عمر جوڑا اب بھی رہتا ہے جو اپنے اندر سے تو ٹوٹ پھوٹ چکا ہے مگر اپنے اکو کی کامیابیوں کے لئے دعائیں مانگنے کی عادت انہوں نے آج بھی ترک نہیں کی۔

مشرقِ وسطیٰ کے خریدار متوجہ ہوں .....

سعودی عرب اور خلیج کی دیگر ریاستوں سے آنکھ مچولی کے بعض خریدار اپنے پتے کی تبدیلی سے ہمیں آگاہ تو کرتے ہیں مگر اس طرح کہ اپنا پتہ بھجوا دیتے ہیں اور ڈاک کے پرانے پتے یا خریداری کا سابقہ حوالہ نہیں دیتے..... اس طرح ہمارے لئے یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی کون سے خریدار کی ہے ..... براہ کرم ایڈریس میں کسی تبدیلی کی صورت میں پرانے پتے اور نام کا حوالہ ضرور دیں۔ (ادارہ)

نیاز احمد مدنی

میں نے بھارت میں کیا دیکھا

اس بار موسم سرما کی تعطیلات سے بہت پہلے نانی اماں اعلان کر چکی تھیں کہ وہ بھارت جا کر خورشید بھائی کی شادی میں شریک ہوں گی۔ یہی نہیں انہوں نے امی جان، چھوٹی خالہ اور ماموں کو بھی حکم دے رکھا تھا کہ انہیں بھی اپنی بڑی بہن عاصمہ کے گھرانے کی اس خوشی میں شرکت کے لئے بچوں کو ہمراہ لے کر ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔ کس کی مجال تھی کہ نانی اماں کا حکم ٹالتا۔ زور و شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں کپڑے سیئے اور تحفے تحائف خریدے جانے لگے۔ پاسپورٹ ویزے اور دوسری سفری دستاویزات کے حصول کے لئے ماموں میاں اور انور بھائی نے رات دن ایک کرنے شروع کر دیئے اور ہم تھے کہ ان تیاریوں کو شوق اور دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اس گھڑی کا بڑی بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔ جب تعطیلات شروع ہوں اور ہم بھارت کے اس پہلے سفر پر روانہ ہوں جہاں ہماری خالہ امی، خالو، ابا اور ہماری خالہ زاد بہنیں اور بھائی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے جس کا ان کے خطوط سے مسلسل اظہار ہو رہا ہے تھا۔

ہمارا اضطراب اور شوقِ سفر اب اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ ہر رات کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جلدی جلدی اپنا ہوم ورک مکمل کرتے اور پھر نانی اماں کے قریب سمٹ آتے جو عشاء کی نماز اور وظائف سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کر رہی ہوتیں ہم انہیں گھیر لیتے اور ہندوستان اور وہاں اپنے رشتہ داروں کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتے جن کا وہ مسکرا مسکرا کر بڑی محبت اور شفقت سے جواب دیتیں۔ اس قسم کی دلچسپ نشستوں میں کبھی کبھی ماموں میاں اور انور بھائی بھی شریک ہو جاتے۔ ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے میں نے نہ جانے کس خیال کے تحت نانی اماں سے پوچھ لیا کہ یہ خالہ امی ہندوستان میں کیوں رہتی ہیں ہمارے ساتھ آ کر یہاں کیوں نہیں رہتیں۔

"بیٹا! یہ بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔" دادی اماں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "پاکستان ہمارا وطن ہے ہماری جانیں اس پر قربان رہتی دنیا تک یہ قائم و دائم رہے لیکن بیٹا اس کے بننے میں بے پناہ قربانیاں دینی پڑیں اور

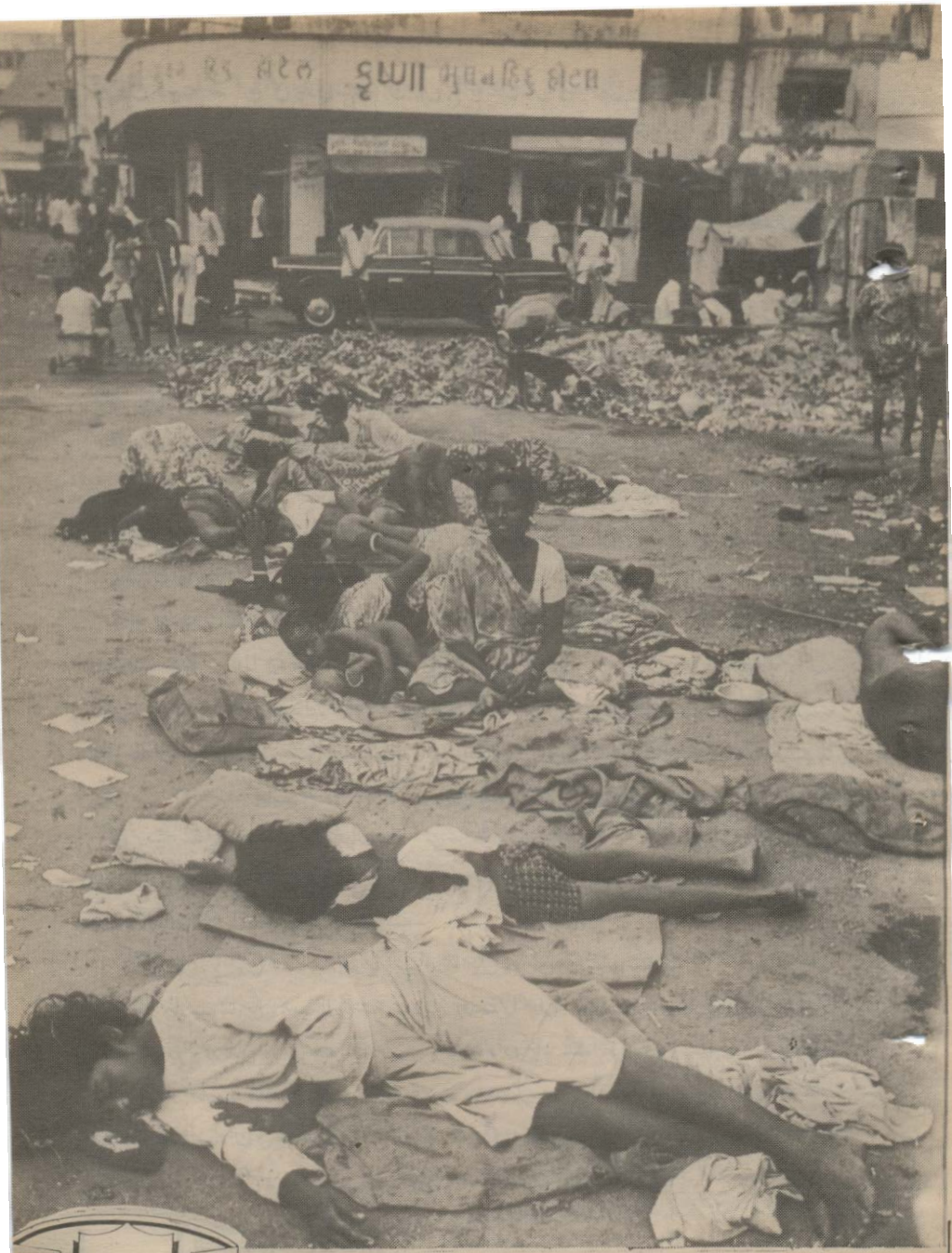

قربانیوں کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ان بیش بہا قربانیوں میں ایک قربانی یہ بھی ہے کہ عزیزوں، رشتہ داروں اور پیاروں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑا۔ ماں ہندوستان میں رہ گئی تو بیٹا پاکستان آگیا، بھائی وہاں رہ گئے تو بہن روتی بلکتی یہاں چلی آئی، باپ نے ہندوستان میں رہنا پسند کیا تو بیٹوں نے نئی اسلامی مملکت میں مستقبل سنوارنے کا فیصلہ کیا۔غرض یہ کہ گھر کے گھر اور خاندان کے خاندان تقسیم ہوگئے۔ پاکستان ہجرت کر کے آنے والے خاندانوں میں شاید ہی کوئی ایسا گھرانہ ہوگا جو عزیزوں اور رشتہ داروں کی جدائی کے صدمہ سے بچا ہوگا۔ ہمارا گھرانہ بھی اس صدمہ سے دوچار ہوا ہے۔ تمہاری خالہ امی تمہارے نانا میاں کی بڑی چہیتی بیٹی تھیں۔ اپنی تمام اولاد میں وہ عاصمہ (ہماری خالہ امی) کو بہت چاہتے تھے۔ اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کے لئے انہوں نے ان کا رشتہ بھی اپنے بھتیجے سے کیا تھا۔ تمہارے نانا میاں اپنے بڑے بھائی یعنی تمہارے نانا ابا کو بھی بہت چاہتے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ دنیا میں بڑے بھیا اور عاصمہ ہی میری محبوب ہستیاں ہیں۔ پاکستان بنا تو تمہارے نانا میاں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے حاصل کئے گئے اس خطّہ میں ہی وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن بسر کریں گے اور اس کی تعمیر و ترقی میں وہ اپنا کردار ادا کریں گے۔ اس وقت وہ محکمہ ریلوے کے ایک بڑے افسر تھے اور انہوں نے حکومت کو اپنے ان فیصلوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ پاکستان کو اس قسم کے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جو اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر میں اپنی لیاقت اور تجربے کے ذریعہ بیش بہا خدمات انجام دے سکیں۔ لیکن ان کے اس جذبہ اور حوصلہ کو اس وقت سخت ٹھیس لگی جب ان کے بڑے بھائی یعنی تمہارے نانا ابا نے ان کے اس فیصلہ سے اختلاف کیا اور انہوں نے ہندوستان ہی میں رہنے پر زور دیا۔ تمہارے نانا میاں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی وہ خود چونکہ حکومت کو اپنے فیصلہ سے مطلع کر چکے تھے اس لئے اب ان کا وہاں رکنا ممکن نہ تھا لہٰذا دل پر پتھر رکھ کر انہیں اپنے بڑے بھائی اور اپنی عزیز از جان بیٹی کو چھوڑ کر یہاں آنا پڑا لیکن یہ صدمہ ان کی جان کا روگ بن گیا جب تک زندہ رہے بڑے بھیا اور عاصمہ ہی کو یاد کرتے رہے۔"

"نانی اماں! پاکستان آنے کے بعد کیا آپ اور نانا میاں پھر کبھی ہندوستان گئے تھے"؟ عاصم نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! تمہارے نانا میاں جب ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے یہی کیا کہ میرا اور اپنا پاسپورٹ بنوایا اور بھائی اور بیٹی سے ملنے بھارت جانے کا ارادہ کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو تمہارے نانا میاں بڑے بھیا اور عاصمہ سے مل کر اس قدر روئے کہ بے ہوش ہوگئے اور سارے گھر والے ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے، میں بھی پریشان ہوگئی۔ بڑی مشکل سے ان کی حالت سنبھلی۔ تین ماہ تک ہم لوگ وہاں رہے۔ اس پورے عرصہ میں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمہارے نانا نے کسی

لمحے بھی بڑے بھیا یا عاصمہ کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دیا ہو۔ جب ہم واپسی کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو اس وقت کا منظر میں تم لوگوں کو کیا بتلاؤں! بڑے بھیا تو رات کو ہی گھر سے کہیں چلے گئے تھے اس لئے کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جدائی کا لمحہ ان کے چھوٹے بھائی پر قیامت بن کر گذرے گا اور ان میں یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی عاصمہ نے اپنا کمرہ بند کر لیا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تمہارے نانا میاں نے صبر و ضبط کا ناقابلِ یقین مظاہرہ کیا وہ سب کچھ جانتے بوجھتے جذبات پر قابو کئے رہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ ان کے دل و جان پر کیا گذر رہی ہے لیکن وہ تھے کہ "چپ کا پہاڑ" بنے ہر ایک سے رخصت ہوتے رہے۔ ہمیں ریلوے اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لئے آنے والے ہر فرد کی آنکھ اشکبار تھی۔ خود میرا کلیجہ بھی کٹا جارہا تھا لیکن تمہارے نانا کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔ جب گاڑی چل پڑی اور تمام عزیز نظروں سے اوجھل ہو گئے تو انہوں نے مجھ سے اس وقت بھرائے ہوئے لہجہ میں جو بات کہی اسے یاد کر کے آج بھی میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے انہوں نے کہا تھا "شمسہ بیگم! ان لوگوں سے یہ میری آخری ملاقات تھی اب شاید ان سے ملنا میرے نصیب میں نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ اوپر کی برتھ پر جا کر خاموش ہو کر لیٹ گئے میرے بچو! تمہارے نانا کی یہ بات درست نکلی واپس آنے کے کچھ ہی سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔"

انتظار کی گھڑیاں بالآخر ختم ہوئیں اور ۲۵ دسمبر کی وہ سہانی شام آپہنچی جب ۶ بڑوں اور ۵ چھوٹوں یعنی کل ۱۱ افراد پر مشتمل یہ مختصر سا قافلہ بھارت جانے کے لئے بذریعہ تیز گام لاہور روانہ ہوا۔ انور بھائی نے فرسٹ کلاس سلیپر کے دو کوپے ریزرو کروائے تھے جس کی وجہ سے کراچی سے لاہور تک کا یہ سفر کسی خاص دشواری کے بغیر طے ہو گیا۔ اگلی صبح ہم لاہور اسٹیشن پر اترے ۳ گھنٹے بعد امیگریشن اور کسٹم چیکنگ سے فارغ ہو کر امرتسر جانے والی سمجھوتہ ایکسپریس میں سوار ہوئے جو وہاں سے ایک بجے روانہ ہوئی اور تقریباً دو بجے بھارتی بارڈر اسٹیشن اٹاری پہنچی۔ اٹاری ریلوے اسٹیشن پر ایک مصیبت وہاں آوارہ گھومنے والے کتوں کی تھی کسی مسافر کا کھانا یا ناشتہ ان سے محفوظ نہ تھا۔ کسٹم اور امیگریشن کے بعد جب ہم لوگ پلیٹ فارم پر ایک جگہ بیٹھے کھانا کھانے پر مصروف تھے تو بلا مبالغہ آٹھ دس خونخوار قسم کے کتوں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور مسلسل اسی بات کی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح وہ ہمارے سامنے رکھے ہوئے پراٹھوں اور کبابوں کو اُچک لے جائیں لیکن ماموں میاں کی چھڑی جسے وہ کبھی کبھی اپنے چاروں طرف گھما دیتے تھے ان کتوں کو مزید پیش قدمی سے روکے ہوئے تھی۔ اس دوران کئی بار شور مچا کہ کتے دوسرے مسافروں کے کھانے کا سامان اُچک لے گئے یا انہوں نے مختلف لوگوں کے دسترخوانوں پر منہ ڈال دیا۔ مجھے حیرت تھی کے اٹاری پر اتنے اچھے انتظامات کے باوجود منتظمین ان ڈھیٹ کتوں پر کوئی توجہ کیوں نہیں

دیتے؟ شائد بقول نانی اماں اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندو اور سکھ کتوں کو نجس یا ناپاک نہیں سمجھتے۔ ہم لوگ رات ۸ بجے دہلی اٹاری اسپیشل سے روانہ ہوئے اور رات بھر سفر کرنے کے بعد صبح ساڑھے چھ بجے دہلی پہنچے۔ ملگجے اجالے میں دہلی ریلوے اسٹیشن پر ہمیں محسوس ہوا کہ ماحول کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ سخت سردی میں پلیٹ فارموں پر جا بجا آگ کے دہکتے الاؤ اچھے لگے "گرم چائے" اور "آلو پوری" کی آوازیں نامانوس سی محسوس ہوئیں۔ پلیٹ فارم پر دور دور تک پھٹے پرانے کمبلوں اور لحافوں میں لپٹے سوتے جاگتے مسافروں اور بُرے حالوں آگ تاپتے قلیوں اور دوسرے لوگوں کو دیکھ کر بھارت میں عام غریبی کا احساس ہوا۔ جابجا آویزاں سائن بورڈز پر ایک نامعلوم زبان نظر آئی۔ اس کے علاوہ ٹرینوں کی آمد و رفت کے بارے میں اعلان کرنے والے اناؤنسر کی زبان اور اس کا لب و لہجہ بھی الجھن میں مبتلا کرتا رہا۔ دل و دماغ میں متعدد سوالات کی یلغار تھی لیکن نانی اماں، امی جان، چھوٹی خالہ، ماموں میاں اور انور بھائی کے چہروں سے سفر کی اذیت اور تکان کے اثرات اتنے واضح تھے کہ ہم سب بچے، خاص طور پر میں اور عاصم یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اس وقت کسی سوال کا کوئی موقع نہیں اور تو اور باتونی نادرہ کو بھی شاید موقع کی نزاکت یا پھر سخت سردی نے خاموش کیا ہوا تھا۔

ماموں میاں اور انور بھائی نے ہم سب کو پلیٹ فارم پر نسبتاً ایک صاف ستھری جگہ پر بٹھایا۔ قلیوں نے سامان ہمارے قریب رکھ دیا اور پھر انور بھائی ہمارے پاس ہی رک گئے لیکن ماموں میاں ان قلیوں کو لے کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اور عاصم نے انور بھائی سے پوچھا کہ ماموں میاں کہاں گئے ہیں؟ بولے "ٹکٹ لینے اور ٹرین پر ریزرویشن کرانے گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔" انہوں نے قریب کے ٹی اسٹال سے تھرماس میں گرم گرم چائے بھروائی اور امی جان کو دیکر بولے، "اب سب لوگ پہلے چائے پی لیں تاکہ اس سخت سردی میں کچھ حواس درست ہوں۔" واقعی سب کی حالت بہت غیر تھی۔ خاص طور پر نانی اماں سے موسم کی سختی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت گرم گرم چائے پینے کا جو مزا آیا وہ شاید اب کبھی نہ آئے۔ چائے پی کر حواس ذرا بحال ہوئے۔ میں، عاصم اور انور بھائی قریب ہی آگ کے جلتے ہوئے الاؤ کے پاس جا کھڑے ہوئے لیکن آگ تاپتے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ماموں میاں سردی سے کانپتے قلیوں کے ہمراہ واپس آگئے۔ آتے ہی بولے "چلو جلدی کرو میں ٹکٹ لے آیا ہوں، گاڑی تیار ہے دوسرے پلیٹ فارم پر چلنا ہوگا۔" قلیوں نے سامان اٹھایا اور ہم لوگ قریب قریب دوڑتے ہوئے دوسرے پلیٹ فارم تک آئے۔ ٹرین واقعی چھوٹنے والی تھی۔ ہم لوگ جیسے ہی ڈبہ کے اندر پہنچے اور ماموں میاں نے قلیوں کو پیسے دیئے ٹرین چل پڑی۔ میں کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ماموں میاں نے جب قلیوں کو پیسے دیئے (مجھے اندازہ نہیں کہ کتنے پیسے دیئے) تو انہوں نے ان کے آگے اپنے

دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ان کی آنکھوں میں نمی اور چہرے سے کچھ عجیب قسم کا احساس چھلکنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور محسوس کرتا وہ دونوں میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے ماموں میاں سے قلیوں کے اس رویہ کے بارے میں پوچھ ہی لیا وہ بولے "میاں غریب لوگ ہیں اس سخت سردی میں میں نے ان کی دوڑ بھاگ اور غربت کے پیش نظر ان کی اپنی توقع سے زیادہ ہی رقم دے دی جس کے لئے یہ شکر گذاری کا اظہار کر رہے تھے" میں سوچ رہا تھا کہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر جب محض تھوڑی دور تک سامان لانے کے لئے تین قلیوں کو ڈیڑھ سو روپے دیئے گئے تو ان کے چہرے بگڑے ہوئے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ رقم دے کر ان کی توہین کی گئی ہے جب کہ دہلی ریلوے اسٹیشن کے ان دو قلیوں نے محض ساٹھ روپے پاکر اس قدر خوشی محسوس کی کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں راستہ بھر ہم اونگھتے اور سوتے رہے یا پھر پاکستان سے لائے ہوئے رسالے اور ڈائجسٹ پڑھتے رہے۔ علی گڑھ اور اٹاری اسٹیشنوں پر انور بھائی نے کچھ رسائل اور اخبارات خریدے بھی تو وہ سب انگریزی میں تھے نادرہ نے اردو رسائل کی فرمائش کی تو انور بھائی نے بتایا کہ ریلوے بک اسٹالوں پر اس وقت سوائے ایک آدھ اخبار کے کوئی اچھا اردو کا رسالہ یا میگزین نہیں۔ جیسے جیسے منزل مقصود قریب آتی جا رہی تھی ہمارے اندر اضطراب اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی نادرہ کی زبان اب پوری رفتار سے چل رہی تھی اور وہ نانی اماں، چھوٹی خالہ اور ماموں میاں سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھی۔ اب منزل کتنی دور ہے؟ خالہ امی، شبو باجی، دردانہ آپی ندیم اور خورشید بھائی اسٹیشن پر لینے آئیں گے کہ نہیں؟ خالہ امی کا گھر اسٹیشن سے کتنی دور ہے؟ ان کے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟ خالہ امی مجھے پہچانیں گی کہ نہیں؟ وہ شہر کتنا بڑا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں؟ کراچی جتنا ہے یا اس سے چھوٹا، غرض ایک منہ ہزار باتیں سب ہی لوگ نادرہ بی بی کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں مزے لے رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لئے اونگھ گئی۔ اسی دوران ماموں میاں نے اعلان کیا کہ بھئی تیار ہو جاؤ ٹرین اب منزل مقصود پر پہنچنے ہی والی ہے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگ ٹرین سے اتر رہے تھے اور خالہ امی، خالو ابا اور تمام خالہ زاد بھائی اور بہنوں کے علاوہ دیگر بہت سے رشتہ دار ہمارے ڈبہ کی طرف لپکتے چلے آ رہے تھے۔

پھر کیا ہوا آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے

معروف صحافی جناب نیاز احمد مدنی صاحب نے یہ سفر نامۂ بھارت بطورِ خاص "دِل دِل پاکستان نمبر" کے لئے تحریر کیا تھا۔ سفر نامہ تاخیر سے ملنے کے باعث خاص نمبر میں شامل نہ ہو سکا اس کی پہلی قسط آپ پڑھ چکے ہیں ... انشاء اللہ اس کی دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ (اکتوبر ۱۹۹۰) کے شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔

خوشخبری

آنکھ مچولی کا آئندہ خاص نمبر

صرف اور صرف بچّوں کے متعلق ہوگا۔

بچّوں کے ناقابل یقین کارنامے　　دیس دیس کے بچّے اور ان کی باتیں

بچّے جنھوں نے بڑوں کو مات دی　　علمی معرکے سر کرنے والے بچّے،

دنیا بھر میں شہرت پانے والے بچّوں کا تعارف

بچّوں کے کرداروں کے گرد گھومتی ہوئی کہانیاں

بچّوں کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں

اُردو کی تاریخ میں پہلی بار بچّوں کی اہمیت کو تسلیم کرواتا ہوا..... بچّوں کی صلاحیتوں کا لوہا منواتا ہوا۔ بچّوں کے دلوں کی آواز اور ان کے جذبات کا ترجمان بن کر آنکھ مچولی کا خاص نمبر دسمبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ کے مشوروں ..... تجاویز..... اور آپ کی تحریروں کا خیر مقدم کیا جائے گا.....

تفصیلات آئندہ ماہ پڑھنا نہ بھولیئے

مقابلہ
نمبر ۶

غزل پزل

اُسامہ بن سلیم

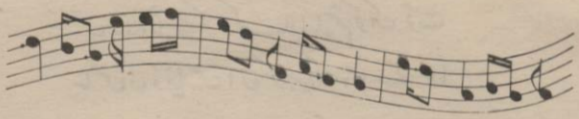

معلومات اور ذہانت کا منفرد ماہانہ مقابلہ

ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد ہم پھر حاضر ہیں۔ گذشتہ ماہ ہم نے غزل پزل کا مقابلہ تو شائع نہیں کیا مگر غلطی سے کوپن شائع ہو گیا تھا اس غلطی پر بہت سے ساتھیوں نے توجہ دلائی۔ ہم ان کے ممنون بھی ہیں اور معذرت خواہ بھی۔ ۱۰ تصاویر / اسکیچز یا علامتیں آپ کے مشاہدے اور امتحان کے لئے حاضر ہیں۔ غور سے دیکھئے اور لکھئے کہ آپ نے کیا سمجھا۔ ؟ ۱۰ اشعار بھی آپ کی مدد کے لئے موجود ہیں ایک شعر ایک تصویر کو سمجھنے کے لئے واضح اشارہ ہے۔ مقابلے میں شرکت کی آخری تاریخ ماہ رواں کی ۱۵ ہے مقابلے کے کامیاب شرکاء میں سے تین کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جائیں گے جبکہ بقیہ کامیاب شرکاء کے نام شامل اشاعت کئے جائیں گے۔

تو پھر تیار ہو جائیے .... نیا مقابلہ حاضر ہے۔ (مرتّب)

اِن کی عظمت کے سب قائل اِن کو سب نے مانا
شعروں میں کیا درس دیا ہے کیا کہنے مولانا

ملکوں ملکوں ڈھونڈا اس کو پھر بھی سمجھ نہ آیا
کیسا جھنڈا ہے یہ آخر جلدی سے بتلانا

دنیا بھر سے بیماری کو مار بھگانے والی
انگریزی میں نام ہے اس کا کچھ جانا پہچانا

جتنا بھی ہو ممکن تم سے اتنی جان لڑا دو
پوری قوت سے تم اس کو آگے تک لے جانا

جس نے ثابت کر دکھلایا ایٹم کو اک قوت
سائنس کی دُنیا میں اس کو ہر اک ہی نے مانا

جس نے چت کر ڈالا ہے دُشمن کے ہر پیادے کو
بازی جیتنے والے اس مہرے کا نام بتانا

ساحل ساحل دیکھو اس کو ڈھونڈو پانی پانی
پھر جو چاہو تو پا لینا پھر چاہے کھا جانا

چاند نگر کو جانے والا دیکھو تو یہ کیا ہے
پہلے خود تو سمجھو اس کو پھر سب کو سمجھانا

اس کی شان و شوکت کو بھی دیکھا تھا عالم نے
دنیا بھر کے کھیلوں کا یہ مرکز بڑا پرانا

کھیل کہانی اور قصوں میں سب سے طاقتور ہے
اس سے بچ کے رہنا ساتھی اس سے مت بھڑ جانا

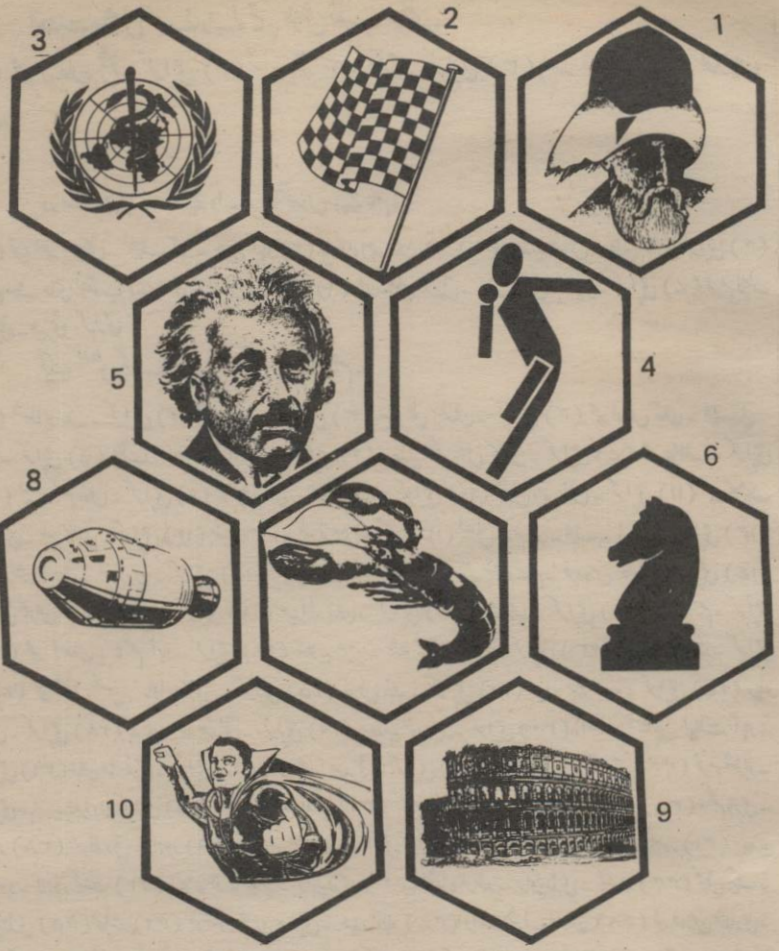

مقابلہ نمبر ۵ (جولائی ۱۹۹۰ء) کے درست جوابات۔

(۱) الّو (۲) جاپان (۳) نرس (۴) کیکٹس (۵) کیپسٹن (لنگر کی چرخی) (۶) جاپانی رسم الخط (۷) آگے پھسلن ہے (۸) اسنوکر (رنگ برنگی گیندیں صرف اسنوکر میں ہوتی ہیں لیکن بلیئرڈ بھی تقریباً اس طرح کا کھیل ہے) (۹) زحل (۱۰) شیکسپیئر

انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی۔

(۱) محمد ریحان شیخ۔ کراچی (۲) سید باقر حسین منورؔ۔ کراچی (۳) اسد عطام فیاضی۔ کھاریاں کینٹ۔

درست جوابات دینے والے ساتھیوں کے نام۔

(۱) نوید احمد صدیقی۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد (۲) فدان احمد خان لاہور (۳) سعدیہ عباس۔ ماڈل کالونی کراچی (۴) محمد یوسف حاجی یعقوب (۵) نوریہ اسحاق۔ کراچی (۶) محمد فیصل فاروق۔ ایف۔ بی۔ ایریا۔ کراچی (۷) ارم فاطمہ صدیقی۔ ملیر سٹی۔ کراچی

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام۔

(۱) شہلا یوسف۔ کراچی (۲) قراۃ العین۔ کراچی (۳) سیّد علی سلمان۔ کراچی (۴) محمد اویس خان۔ ایف بی ایریا۔ کراچی (۵) ثاقب اسلام۔ ناظم آباد۔ کراچی (۶) سعدیہ نجم ماڈل کالونی۔ کراچی (۷) محمد عاطف۔ کراچی (۸) محمد عاصم خان۔ کراچی (۹) کامران حیدر۔ ناظم آباد۔ کراچی (۱۰) شکیل احمد خان۔ کراچی (۱۱) محمد کاشف انصاری۔ ملیر کالونی۔ کراچی (۱۲) مہیب مظہر۔ ملیر توسیعی کراچی (۱۳) فیصل غلام محمد۔ ایف۔ بی ایریا۔ کراچی (۱۴) سید ارشد جیلانی۔ بفرزون۔ کراچی (۱۵) عمران اللہ۔ کراچی (۱۶) سیّد شہزاد عالم۔ فردوس کالونی۔ کراچی (۱۷) مصطفیٰ عمران علی۔ ناظم آباد۔ کراچی (۱۸) عبداللہ خان۔ کراچی (۱۹) عائشہ مجید۔ کراچی (۲۰) شگفتہ نسیم۔ کراچی (۲۱) محمد آصف۔ ناظم آباد۔ کراچی (۲۲) شاذیہ عزیز۔ شاہ فیصل کالونی۔ کراچی (۲۳) سلمان عبداللہ۔ کراچی (۲۴) محمد فیصل محسن۔ ماڈل کالونی۔ کراچی (۲۵) عدیل خالد۔ کراچی (۲۶) سیدہ حنا منورہ۔ کراچی (۲۷) رباء رفیق۔ کراچی (۲۸) عدنان احمد صدیقی۔ کراچی (۲۹) سعدیہ خورشید۔ کراچی (۳۰) آصف حسین۔ لیاقت آباد۔ کراچی (۳۱) امان اللہ فرخ۔ کراچی (۳۲) محمد عمیر صدیقی۔ کراچی (۳۳) محمد آصف۔ کراچی (۳۴) خرم شہزاد۔ کراچی صباوجیہ بفرزون کراچی (۳۵) ظلّ شہباز۔ لاہور (۳۶) عظیم الرحمٰن ثانی۔ اقبال ٹاؤن۔ لاہور (۳۷) انجم ہاری۔ لاہور (۳۸) عمر فاروق۔ لاہور (۳۹) سفیان حفیظہ۔ اقبال ٹاؤن۔ لاہور (۴۰) تابندہ ریاض۔ لاہور (۴۱) سعدیہ مسعود۔ لاہور کینٹ (۴۲) ایم عاطف خواجہ۔ راولپنڈی (۴۳) شیزہ ارشد۔ راولپنڈی۔ کینٹ (۴۴) نبیل بیگ۔ راولپنڈی (۴۵) عائشہ (۴۶) خوشنور حسن صدیقی۔ حیدر آباد (۴۷) راشد اشرف اعوان (۴۸) نورالامین انظاری۔ حیدر آباد (۴۹) سیمارانی۔ حیدر آباد (۵۰) مکیش کمار۔ حیدر آباد (۵۱) اسد علی خان۔ حیدر آباد (۵۲) آغا مرسب محمود۔ حیدر آباد (۵۳) عمر نوید راجپوت۔ سکھر (۵۴) محمد سلیم بھٹی۔ سکھر (۵۵) محمد امجد ملک۔ ٹنڈو الہ یار (۵۶) طاہر علی۔ ایبٹ آباد (۵۷) جہانزیب اشفاق۔ ضلع گجرات (۵۸) فرمان بشیر۔ ملتان (۵۹) حسن رضا سعید۔ میرپور میرس (۶۰) نوید ارشد۔ ملتان (۶۱) محمد کاشف۔ بہاولپور (۶۲) محمد سلمان خان سنبل۔ بورے والہ (۶۳) حنا ماجد۔ حسن روڈ (۶۴) محمد عدیل۔ پشاور (۶۵) ریاض احمد سولنگی۔ کوئٹہ (۶۶) فیصل مسعود احمد۔ نواب شاہ (۶۷) محمد حسن۔ فیصل آباد (۶۸) عنبر خان پاشا۔ بہاولپور (۶۹) شاہ نواز علی۔ مردان (۷۰) آصف وقار آصف۔ واہ کینٹ (۷۱) کامران طارق۔ پشاور (۷۲) عمران احمد۔ کوہاٹ (۷۳) زاہد حنیف۔ حیم یار خان۔ سعدیہ مقصود۔ جہلم۔

دعوت کا بلاوا

سرزمینِ انڈونیشیا کی ایک سبق آموز کہانی

☆

بہت زمانے کی بات ہے مالانگ ندی کے کنارے ایک آدمی رہتا تھا۔ جس کا نام پاموجو تھا۔ ایک دن اس نے سنا کہ کیرو موجو ندی کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا، ایک شان دار عام دعوت کر رہا ہے جس میں بغیر امتیاز کے سب ہی شریک ہوں گے۔ پاموجو دعوت کے بارے میں سوچتا ہوا گھر پہنچا۔ وہ اپنی بیوی سے بولا۔

"بہت زمانے سے میں نے کوئی ایسی چیز نہیں چکھی جس سے میری بھوک مٹ سکے۔ تم تو ہمیشہ بس چاول ابال کر سامنے رکھ دیتی ہو۔ آج میں کیرو مو کے یہاں دعوت میں جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو اپنی ماں کے یہاں ہو آؤ۔"

بیوی یہ سن کر جل ہی تو گئی وہ بولی، "میں تو خود کو تھکا تھکا کر تمہارے لئے یہ سب کرتی رہتی ہوں۔ لیکن تم ہو کہ یوں میری جان جلا کر بدلہ چکا رہے ہو۔ بھئی واہ خوب شکریہ ادا کیا تم نے۔" وہ

اٹھی اور کپڑے بدل کر چھٹی گزارنے کو چل دی۔

پاموجو نے بھی اٹھ کر کپڑے بدلے۔ اپنی سب سے اچھی سارونگ (تہ بند) پہن کر وہ اپنی ناؤ میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ جب وہ جا رہا تھا تو اسے اور بھی بہت سے لوگ ملے جو بھڑکیلے لباس زیب تن کیے گاتے ہوئے اور ایک دوسرے کو خوشی سے اشارہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ پاموجو بھی اس راگ رنگ کی محفل میں شریک ہو گیا۔ لیکن جب کیرومو کے گھر کے قریب پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سی ناویں واپس جا رہی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ کیوں واپس آ رہے ہیں۔ اس نے لپک کر ان میں سے ایک آدمی سے جسے وہ جانتا تھا، پوچھا، "کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

"ارے تمہیں نہیں معلوم مچمنڈ آج دعوت کر رہا ہے جس میں ہم سب کو بلایا گیا ہے۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

پاموجو جواب میں خاموش رہا اس نے سوچا "مچمنڈ بہت دریا دل ہے۔ کیرومو سے کہیں زیادہ مہربان ہے لیکن افسوس وہ بھی اسی دن دعوت دے رہا ہے جب کیرومو دعوت کا انتظام کر رہا ہے کیوں نہ اس کی دعوت میں چلا جاؤں" یہ سوچ کر اس نے اپنی کشتی کا رخ موڑ دیا اور واپس ہو لیا۔ راستے میں وہ اپنے گھر کے پاس سے بھی گزرا لیکن وہ بغیر رکے اسی طرح چپو چلاتا ایک ہی رفتار سے مچمنڈ کے گھر کی سمت بڑھتا رہا۔ جب وہ اس کے دروازے پر پہنچا تو اس نے کچھ لوگوں کو زور زور سے باتیں کرتے سنا۔

"واہ کیرومو بھی کیا عمدہ آدمی ہے آج دعوت میں وہ ایک پوری گائے اور ایک بچھڑا پکوائے گا۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ آج تو میں خوب جی بھر کے کھاؤں گا۔" یہ سن کر پاموجو کا چہرہ اتر گیا۔ "میں بلاوجہ میں مچمنڈ کی دعوت میں جا رہا ہوں وہ کھلائے گا ہی کیا؟ وہی سوکھی چمرخ سی گائے اب بھی پیش کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ پھر پلٹ پڑا اور کیرومو کی گھر کی طرف چل دیا۔ اب سورج نکل آیا تھا۔ گرمی کافی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے ماتھے پر پسینہ چلا آ رہا تھا۔ وہ کنارے بنے ہوئے اپنے گھر کے قریب سے گزرا۔ ایک دم کسی نے پکار کر پوچھا۔ "پاموجو کہاں جا رہے ہو؟"

پاموجو نے منہ اٹھا کر دیکھا یہ اس کا دوست اوانک تھا۔ وہ بولا! "میں کیرومو کے یہاں دعوت میں جا رہا ہوں۔"

"کیوں کیرومو کے یہاں کیوں جا رہے ہو۔ مچمنڈ تو کھانے کے ساتھ ہی روپیہ بھی تقسیم کرے گا۔"

"ہاں سچ ہی تو کہہ رہا ہے۔ مچمنڈ تو یوں بھی بہت سخی ہے۔ پھر میں کیرومو کے یہاں کیوں جاؤں۔" یہ سوچ کر اس نے جلدی سے اپنی کشتی موڑی اور اسے تیزی سے مچمنڈ کے گھر کی طرف لے چلا۔ راستہ میں ایک گاؤں والے نے روک کر کہا۔

"اب بھاگے کہاں جارہے ہو دعوت تو ختم بھی ہوگئی۔" "کیا کہا ختم ہوگئی اور وہ روپیہ جو وہ تقسیم کر رہا ہے"؟ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "سب کچھ ختم ہوگیا دعوت بھی اور روپیہ بھی۔"

بے چارہ پاموجو..... اس کا دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روئے۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا اپنی کشتی پر آیا اور جلدی جلدی چپو چلاتا ہوا اسے آگے لے چلا۔ اس کی کوشش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہ کیرومو کے گھر پہنچ جائے۔ بھوک سے آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔

جب وہ کنارے پر پہنچا تو اس نے بہت سے لوگوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ لوگ جھنڈ بنائے جگہ جگہ کھڑے بے فکری سے باتیں کر رہے تھے۔ "کیا آپ لوگ کیرومو کی دعوت میں آئے ہیں۔؟ پاموجو نے پوچھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی اور آواز حلق میں پھنسی لگ رہی تھی۔

"تم بہت دیر میں آئے دعوت تو ختم بھی ہوگئی۔" وہ سب جواب میں بولے۔

پاموجو بہت ہی آہستہ آہستہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنی کشتی کی طرف واپس لوٹا اور گھر کی طرف چل دیا۔ کمزوری سے جیسے اس کا دم نکلا جارہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

گھر پہنچ کر اس نے بہت زور سے چیخ کر اپنی بیوی کو پکارا اور غصے سے بولا "ارے یہ عورت تو کبھی گھر میں ٹکتی ہی نہیں۔ جب دیکھو اپنی اماں کے یہاں بھاگی چلی جارہی ہے۔"

اسے مچھلی کا ایک سوکھا ٹکڑا پڑا مل گیا۔ وہ ایک مشروب کی بوتل نکال لایا اور کھانے کا یہ سامان لے کر اپنی کشتی پر آگیا۔ اس نے بوتل ناؤ کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی۔ اور خود ٹیک لگا کر کھانا شروع کر دیا۔ بیٹھتے وقت تھوڑا سا ناؤ ڈگمگا کر ٹیڑھی ہوگئی اور بوتل ندی میں گر پڑی۔ پاموجو نے مچھلی وہیں چھوڑی اور بوتل کو تھام لینے کے لئے ندی میں کود پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خالی بوتل ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا اس نے دیکھا کہ اس کا چھوڑا ہوا مچھلی کا ٹکڑا ایک کتا کھا رہا ہے۔ ایک دم اس کے گالوں پر آنسو ڈھلک آئے۔ نہ جانے کتنی ناویں ادھر ادھر آجارہی تھیں۔ لوگ گاتے اور قہقہے لگاتے گزر رہے تھے۔ دو دعوتیں ہونے پر بھی پاموجو کو کھانے کا ایک دانہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ پاموجو کی درگت کا ذکر جب جیلوا کے لوگ کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں!

"جو لوگ فیصلہ نہیں کر پاتے ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یعنی نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔"

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴	
یونائیٹڈ بک لینڈ۔ سکھر	ایم۔ ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر
"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

قُرۃُ العَین سلیم

چَنْدا مَامُوں دُور کے

غزالی کو چاند ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔ روشن اور ٹھنڈا، بادلوں کے پیچھے چھپتا اور نکلتا۔ اسے یقین تھا کہ چاند میں کہیں کوڑا نہیں ہو گا، گندگی نہیں ہوگی، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، جھونپڑیاں، گندے بچے نہیں ہوں گے۔ خوفناک استاد اور جگہ جگہ بکھرے پتھروں اور مٹی کے ڈھیر۔ یہ سب تو زمین کا حصّہ ہیں۔ چاند میں ایسا ناممکن ہے۔ اسے نیل آرم اسٹرونگ پر بڑا رشک آتا۔ کیسے اس نے وہاں پہلا قدم رکھا ہو گا، کیسے وہ چاند کی ٹھنڈی اور اجلی زمین پر ٹہلا ہو گا۔ کاش میں بھی ایک بار چاند پر جاسکوں۔ بس پھر تو کبھی نہ پلٹوں گا۔ چاند بھی کوئی واپس پلٹنے کی جگہ ہے۔

اکثر اسکول میں سزا ملنے پر، جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر دیکھ کر، جھونپڑیاں اور ان کے گرد گندے بچے کھیلتے دیکھ کر وہ سوچا کرتا۔ اس کی اپنے بہن، بھائیوں سے بہت اچھی دوستی تھی مگر جب کبھی ان سے لڑائی ہو جاتی یا اس کے کسی کام کے دوران وہ اودھم مچا رہے ہوتے تو وہ جھنجلا کر یہی سوچا کرتا۔ کاش میں چاند پر ہوتا۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب وہ بہت چھوٹا تھا اور رات سونے سے پہلے دادی اماں کے پاس لیٹ کر کہتا۔ "دادی اماں کوئی کہانی سنائیں" تو دادی اماں ہمیشہ اسے چاند کی کہانی سنایا کرتیں کیونکہ ایک یہی کہانی انہیں یاد تھی اور جب کبھی وہ امی کے ساتھ چھت پر ٹہلتا تو اکثر امی گنگناتیں۔ چندا ماموں دور کے۔ اور چندا ماموں واقعی بہت دور تھے۔

بچوں کے پاس جنوں، پریوں کی، ٹارزن یا روبوٹ کی کہانیاں ہوا کرتی ہیں۔ اس کے پاس چاند والی کہانیاں ہوا کرتیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ چندا ان کے لئے کیا کچھ تھا۔ خواب بھی، تجسس بھی، تحفظ بھی اور دوست بھی، جب سے شہر میں ہنگامے رہنے لگے تھے آئے دن کرفیو اور لوگوں کے ایک دوسرے سے لڑنے اور مرنے کی خبریں۔ تب سے وہ وحشت زدہ ہو کر چاند پر پہنچنے کی ترکیب سوچا کرتا۔

جب کبھی دوست مل کر بیٹھتے اور بہت سی باتوں کے درمیان پسندیدہ جگہ کا ذکر چھڑتا۔ آصف کہتا میری پسندیدہ جگہ تو کشمیر ہے، میں بڑا ہو کر کشمیر ضرور جاؤں گا۔ رفیع کو اپنا گاؤں بہت پسند تھا جہاں اس کے دادا، دادی رہتے تھے، تایا رہتے تھے بس اس کے ابا ہی شہر آ گئے تھے۔ وہ کہتا میں تو بڑا ہو کر اپنے گاؤں جاؤں گا۔ اسے کھیتی باڑی اچھی لگتی تھی۔ وہ جب چھٹیوں میں گاؤں جاتا۔ گھنٹوں اپنے تایا کے کھیت میں کھڑا فصل کو لہراتے دیکھا کرتا جو ایسے میں بالکل سمندر کی لہروں کی طرح لگتی۔ خلد کے بڑے بھائی امریکہ جا بسے تھے اور اکثر خط میں سب گھر والوں کو وہیں آ کر آباد ہونے کو کہتے مگر اس کے ابو تیار نہ تھے۔ خلد کا ارادہ تھا وہ بڑا ہو کر بھیا کے پاس چلا جائے گا۔ تب غرالی اپنی باری آنے پر کہتا۔ "میری پسندیدہ جگہ تو چاند ہے۔ میں بڑا ہو کر چاند پر جانے کی کوشش کروں گا۔" چاند پر؟ یعنی یہ اپنا چاند جو رات کو نظر آتا ہے۔" ہاں بالکل اپنا یہی چاند" غرالی ہنس کر کہتا۔" کیوں کیا بڑی بی کے بعد چرخے کو چلانے کا ٹھیکہ تمہیں ملنے والا ہے؟" رفیع ہنس کر کہتا۔" مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا چاند کی بڑھیا بھی نہیں۔ نہ بڑھیا نہ اس کا چرخا؟ دوستوں میں سے کوئی حیرت سے کہتا" اور سنا ہے وہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ آصف کہتا" اور چاند پر روشنی بھی نہیں ہے۔ میں نے خود ایک کتاب میں پڑھا ہے۔" خلد بیچ میں ٹوکتا۔" ارے بھئی آکسیجن بھی نہیں، ایک اور آواز آئی، سائنس بہت ترقی کر رہی ہے۔ کیا معلوم ہمارے بڑے ہونے تک کیا ہو۔ غرالی جھنجلا کر جواب دیتا۔" اچھا بابا تم چاند پر ہی جانا۔ پیچھا چھوڑو۔" کوئی ہنس کر ہاتھ جوڑتا اور یہ موضوع یہیں ختم ہو

جاتا۔

آج رات بھی کمبائنڈ اسٹڈی میں وقفے کے دوران دوستوں میں دیر تک یہی موضوع زیر بحث رہا اور خاتمہ اسی ہاتھ جوڑنے پر، تو وہ ناراض ہو کر گھر چلا آیا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی سو چکے تھے اور امی، ابو کے لئے روٹی پکا رہی تھیں کیونکہ وہ دیر سے گھر آتے اور گرم روٹی کھانے کے عادی تھے۔ امی نے اسے دیکھا تو کہا۔ "غزالی! بیٹا جلدی آگئے۔"

"جی امی بس آج کچھ پڑھائی کا موڈ نہیں بنا۔" غزالی نے جواب دیا۔ "امی، ابو نہیں آئے؟" غزالی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"آج تم جلدی آگئے ہو ویسے اب وہ پندرہ منٹ میں آتے ہی ہوں گے۔" امی نے کہا۔ غزالی نے ڈرائنگ روم میں جاکر ٹی وی کھول لیا۔ ایسے ہی کوئی بور انگلش فلم آرہی تھی۔ مگر غزالی پھر بھی بیٹھا دیکھتا رہا۔ نا جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

ابھی اسے سوئے ذرا دیر گزری ہوگی کہ کسی نے دھیرے سے اس کا کندھا ہلا دیا۔ غزالی کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے ایک نازک سی پری کھڑی تھی۔ غزالی کا دل دھک سے رہ گیا۔ یعنی سچ مچ پری۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔

"ہاں سچ مچ پری۔" جیسے اس کی بات سن لی تھی۔

"مگر آپ یہاں کہاں؟" غزالی نے ہمت کی۔

"بس تمہیں تمہاری پسندیدہ جگہ پہنچانے آئی ہوں۔" پری نے مسکرا کر کہا۔

"یعنی!" غزالی نے حیران ہو کر کہا۔

"چاند پر جانا چاہتے ہو نا؟" پری پھر مسکرائی۔

"اوہ میرے خدا کیا واقعی؟ غزالی کو واقعی یقین نہ آیا۔

"ہاں کیوں نہیں تم چاہو تو میں تمہیں چاند تک پہنچا سکتی ہوں۔ تم پھر وہاں سے آ نہیں سکتے۔" پری نے کہا۔

"میں آنا بھی نہیں چاہتا۔ غزالی جوش میں کھڑا ہو گیا۔

"غزالی! اتنے جذباتی مت بنو۔ پہلے اچھی طرح سوچ لو۔" پری اس بار سنجیدہ تھی۔

"نہیں۔" غزالی نے پورے یقین سے جواب دیا۔

"اچھا تو میرا ہاتھ پکڑ لو اور آنکھیں بند کر لو" پری نے غزالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ غزالی نے پری کا ہاتھ تھام لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اب آنکھیں کھول سکتے ہو۔ تم چاند پر پہنچ چکے ہو۔" غزالی نے پری کی آواز سنی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ واقعی چاند پر پہنچ چکا تھا۔ مگر پری اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے کئی بار آواز بھی دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ تب غزالی نے چاند کی سیر کی ٹھانی جہاں وہ رہنا چاہتا تھا کچھ سوچے بنا۔

چاند کہانیوں جیسا خوبصورت تو نہیں تھا۔ بڑے بڑے پہاڑ، میدان۔ مگر پھر بھی آخر چاند تھا۔ غزالی خوشی سے آوازیں نکالتا، بھاگتا پھرا مگر وہ جلد ہی تھک گیا۔ اسے تنہائی بری لگ رہی تھی۔ کاش اس کے ساتھ کوئی ہوتا، پری ہی ہوتی۔ غزالی نے ذرا اداسی سے سوچا۔ غزالی کو چاند پر پہنچے ابھی ذرا دیر ہوئی تھی مگر ابھی سے اسے تنہائی بری لگ رہی تھی۔ غزالی تو چھوٹا تھا نا کبھی تنہا نہیں تھا اس لئے وہ کیسے جان سکتا تھا تنہائی کیسی ہوتی ہے۔ وہ تو سمجھتا تنہائی ہمیشہ پرسکون ہوتی ہے۔ مگر ابھی سے اس کے دل میں اداسی بھر گئی تھی۔ " غزالی نے سوچا، وہ جو دادی اماں کہتی ہیں چاند پر بڑھیا رہتی ہے تو ان کو ہی ڈھونڈا جائے۔ غزالی کہاں کہاں نہ پھرا۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ ایک چڑیا کا بچہ تک نہیں۔ اب اس کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ چڑیا کا بچہ بھی نظر آجاتا تو وہ خوشی سے رو پڑتا۔ مگر چاند پر کوئی بھی نہیں تھا۔

غزالی کو امی یاد آرہی تھیں، ابو یاد آرہے تھے اور چھوٹے بہن، بھائی اس نے چاند کی محبت میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ چاند سے خوبصورت امی، ابو کی محبت اور بہن، بھائیوں کا ساتھ تھا۔ کاش یہاں جھگیوں میں رہنے والا کوئی گندا سا بچہ ہی ہوتا، غزالی نے سوچا۔ حالانکہ ایسے بچے غزالی کو اچھے نہیں لگتے تھے۔ مگر اب مل جاتے تو بہت اچھے لگتے۔ اسے زمین کا سبزہ یاد آرہا تھا بڑے بڑے اونچے درخت اور چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لدے پودے، جنکی اہمیت پر اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ سب کتنے اہم لگ رہے تھے۔ اسے سب لوگ اپنے لگ رہے تھے اور اپنی پوری دنیا یاد آرہی تھی۔

غزالی نے سوچا۔ زمین میں کوڑا کرکٹ ہے مگر سبزہ بھی تو ہے۔ بہت سخت سزائیں دینے والے استاد ہیں، مگر بہت سے شفیق استاد بھی تو ہیں۔ زمین میں نفرت ہے پر محبت بھی تو ہے۔ لڑنے والے لوگ بھی ہیں مگر محبت کرنے والے بھی تو ہیں۔ یہاں تو کچھ نہیں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں واپس زمین پر جانا چاہتا ہوں، سب کے درمیان۔ پری مجھے یہاں سے لے چلو۔ پری، پری مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ غزالی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ امی، امی۔ وہ رو رہا تھا۔

"کیا ہوا غزالی۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔" امی اس کے بال سنوارتے ہوئے پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔ غزالی چند لمحے حیرت سے امی کو دیکھتا رہا۔ "اوہ! تو خواب دیکھ رہا تھا۔" اس نے مطمئن ہو کر ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا دیکھا غزالی؟" امی پوچھ رہی تھیں۔ "کیا دیکھا!" غزالی ہنسا۔ یہی کہ چندا ماموں دور کے۔ یہ کہہ کر اس نے امی کی گود میں سر چھپا لیا۔

جادو نہیں
مگر پھر بھی جادو

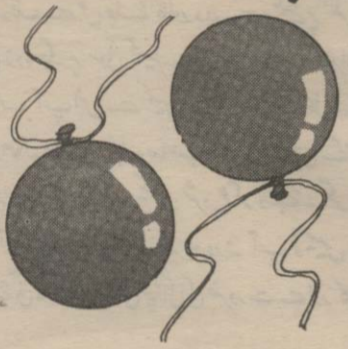

کاشف طاہر
سعودی عرب

آج ہم آپ کو ایک ایسی ٹرک بتاتے ہیں جو جادو نہیں مگر آپ اسے جادو کے علاوہ اور کیا کہیں گے؟

یہ ٹرک بہت آسان ہے اور آپ اس سے اپنے دوستوں کو بخوبی حیران کر سکتے ہیں۔ مگر ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے ورنہ پول فوراً کھل جائے گی۔ اوہو! آپ بھی پریشان ہو رہے ہوں گے کہ تمہید لمبی ہوتی جا رہی ہے اور اصل بات کا کہیں ذکر ہی نہیں۔

ہاں تو جناب! بات یہ ہے کہ آپ نے اکثر ٹیلی ویژن پہ دیکھا ہو گا کہ ایک صاحب غبارہ پھلاتے ہیں۔ آرام سے اس میں سوئی گھسیڑتے ہیں، مگر غبارہ نہیں پھٹتا اور وہ صاحب ہنستے مسکراتے واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پہلے تو ہم بھی بہت حیران ہوئے مگر شو کے آخر میں ان صاحب نے خود ہی حقیقت سے

پردہ اٹھا دیا تو ہم بہت خوش ہوئے اور سوچا کہ آپ ساتھیوں کو بھی یہ ٹرک ضرور بتائی جائے۔ ہاں، تو اس "جادو" کے لئے آپ کو ۳ چیزیں چاہئے ہوں گی۔ ایک عدد غبارہ (پھولا ہوا) ایک عدد سوئی اور پلاسٹک ٹیپ۔

سب سے پہلے آپ غبارے میں جہاں سوراخ کرنا چاہتے ہوں وہاں پین سے ایک نشان لگا لیجئے۔ پھر تھوڑا سا پلاسٹک ٹیپ اس طرح لگائیے کہ وہ نشان ٹیپ کے نیچے آجائے۔ (پلاسٹک ٹیپ ٹرانسپیرنٹ (اسکاچ ٹیپ) استعمال کیا جائے کیونکہ وہ غبارے کے رنگ سے مل جائے گا اور دور سے دیکھنے پر نظر نہیں آئے گا) پھر اپنے کسی بھی دوست کو کہئے کہ وہ نشان زدہ جگہ پر سوئی گھسیڑے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ سوئی چبھونے کے باوجود غبارہ نہیں پھٹا۔ اب آپ اس سے کہیں کہ سوئی واپس نکال لے۔ غبارہ اب بھی نہیں پھٹے گا۔ مگر ۳ یا ۴ سیکنڈ بعد ہلکا سا دھماکہ ہوگا اور غبارہ صاحب غائب ہو جائیں گے دیکھا ساتھیو۔ کتنا آسان جادو ہے یہ۔ لہٰذا آپ فوراً ہی یہ جادو کرنے کی پریکٹس شروع کر دیجئے۔ مگر خیال رہے کہ جب آپ شروع میں غبارہ پر ٹیپ لگائیں تو آس پاس کوئی موجود نہ ہو ورنہ آپ تو یہیں پر ہی پکڑے جائیں گے اور دوستوں میں بے عزتی بھی ہو جائے گی۔ یعنی ذرا سی چالاکی کی ضرورت ہے اور کامیابی یقینی۔

بد تمیز

لارڈ برکن ہیڈ ابھی نوجوان بیرسٹر تھے۔ ایک دن عدالت میں جج مخالف پارٹی کی کھلم کھلا حمایت کر رہا تھا۔ انہوں نے احتجاج کیا جج نے ذرا تلخی سے ڈانٹ پلائی جس کے باعث ان کے درمیان گرما گرم گفتگو ہوئی۔ جج نے طیش میں آکر کہا۔ "میاں صاحب زادے! تم سخت بد تمیز ہو"۔ لارڈ برکن ہیڈ کی قوت برداشت بھی جواب دے گئی۔ انہوں نے فوراً کہا، "دراصل ہم دونوں بد تمیز ہیں فرق یہ ہے کہ آپ کی عادت پختہ ہو چکی ہے۔ اور میں ابھی بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

نوید اختر کراچی

کمسن قلم کار

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھّی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہو سکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

سری نگر کی بیٹیاں

عنایت عزیز قریشی ...... کشمیر

امید کا کھلا چمن
اتر گیا خزاں کا خستہ پیرہن
وہ بے دریغ آ گئیں
سروں پہ باندھ کر کفن
نذر دلیر بچیاں، سری نگر کی بیٹیاں
وہ بے پناہ جوش سے

ہیں جمع لعل چوک میں
ستم گروں کا دست ظلم توڑنے
وہ بڑھ رہیں ہر طرف
جہاں کے ضمیر کو جھنجوڑنے
سہیم گی ساری سختیاں
سری نگر کی بیٹیاں
وہ اپنی جاں پر کھیل کر

دکھا رہی ہیں زندگی کا راستہ
جلا کر شمع حریت
دکھا رہی ہیں ہندوؤں کو آئینہ
مجاہدوں کی لڑکیاں
سرینگر کی بیٹیاں

لعل چوک ...... سرینگر کا مشہور چوک

چراغ تلے اندھیرا

میاں مظہر اقبال آرائیں۔ ملتان

"ابو مجھے ڈھونڈیئے میں کہاں ہوں" یہ آواز سن کر دنیا کے مشہور معروف سائنس دان پروفیسر جان والٹ جو اپنی تجربہ گاہ میں مصروف تھا ایک دم چونک پڑا "ابو مجھے ڈھونڈیئے میں کہاں ہوں۔" آواز دوبارہ آئی۔ پروفیسر والٹ ادھر ادھر دیکھنے لگے کیوں کہ یہ آوازیں اس کی پیاری بیٹی لائم میری کی تھیں۔ پھر میری جو تجربہ گاہ کے ایک کونے میں چھپی ہوئی تھی اٹھ کر اپنے ابو کی طرف دوڑی۔ پروفسر والٹ نے ننھی سی خوبصورت میری کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا اور پیار کرنے لگا۔ پروفیسر والٹ کو اپنی بیٹی سے بے انتہا محبت تھی۔ کیوں کہ ایک تو وہ اس کی اکلوتی اولاد تھی اور دوسرا یہ کہ وہ بہت ہی خوبصورت اور پیاری بچی تھی، پھر میری کی والدہ ان کی پیدائش کے کچھ روز بعد ہی انتقال کر گئیں تھیں۔

پروفیسر والٹ کا خیال تھا کہ اگر الفا، بیٹا اور لیزر شعاعوں کو یورنیم کے دھارے پر سے گزارا جائے تو ایک خاص قسم کے پردے پر انسان ماضی کے حالات دیکھ سکتا ہے۔

آخر کار ایک دن پرفیسر اور وہ ایک ایسی ایجاد کرنے میں والٹ کی کوششیں رنگ لائیں جس کے ذریعہ انسان ماضی کے حالات اور واقعات ایک کیمرے پر دیکھ سکتا تھا مگر ابھی اس ایجاد کا تجربہ باقی تھا۔ آخر پروفیسر والٹ نے تجربے کا دن بھی مقرر کر لیا۔ مگر تجربہ کرنے سے کچھ ہی دن پہلے ایک حیرت انگیز بات پروفیسر والٹ کے مشاہدے میں آئی وہ یہ کہ اگر اسی پروجیکٹ کا تجربہ کیا جائے تو اس سے نکلنے والی خطرناک شعاعیں ٹیلی ویژن کے انٹینا سے گزر کر ریڈیو اور ٹی وی سیٹوں میں داخل ہو سکتی تھیں اور جیسے ہی یہ شعاعیں ٹی وی سکرین سے ٹکراتیں اور اتنی چمکدار روشنی پیدا ہوتی کہ جس سے سامنے بیٹھا ہوا شخص بآسانی جل سکتا تھا۔ اس انکشاف نے پروفیسر والٹ کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ وہ سوچنے لگا اس طرح میرے تجربے سے ہزاروں، لاکھوں لوگوں کو پورے ایک دن کے لئے اپنے ٹی وی بند کرنے پڑیں گے۔ لیکن فوراً ہی اسے ایک خیال آیا اور اس نے حکومت کے ایک کلاندے کو اپنے تجربے اور پروجیکٹ کے متعلق آگاہ کیا۔ اگلے دن ملک کے تمام اخباروں میں خبریں چھپ گئیں کہ فلاں دن بارہ بجے کے بعد سے کوئی اپنا ٹی وی یا ریڈیو نہ چلائے۔ بصورت دیگر وہ اپنے نقصان کا ذمے دار خود ہو گا۔

آخر کار تجربے کا دن بھی آپہنچا۔ پروفیسر والٹ اس دن خلاف معمول وقت سے پہلے ہی اپنی لیبارٹری میں پہنچ گیا۔ اس نے دوسرے سائنس دانوں کو بھی وہاں مدعو کیا ہوا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے پروفیسر والٹ نے پروجیکٹ کا بٹن دبا دیا۔ پردے پر عجیب و غریب تصویریں دکھائی دینے لگیں۔ بڑے بڑے دیو قامت

جانور ، وحشی انسان اور بیابان جنگل نظر آنے لگے۔
پروفیسر والٹ یہ دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا اور دوسرے سائنس دانوں کے چہرے پر بھی خوش کی لہر دوڑ گئی سب سائنس دان پروفیسر والٹ کو اس کی حیرت انگیز کامیابی پر مبارک باد دینے لگے۔

اس روز پروفیسر والٹ کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی لائم میری جب سکول سے گھر آئی تو خلاف توقع اس نے اپنے ابو کو گھر میں نہ پایا۔ ابو کی غیر موجودگی میں لائم میری بہت اداس ہوگئی اس نے سوچا کیوں نہ اداسی کو دور کرنے کے لئے کچھ دیر ٹی وی پروگرام دیکھ لئے جائیں یہ سوچ کر وہ ٹی وی لاؤنج میں چلی گئی۔

"میری! ، مائی سویٹ میری تم کہاں ہو۔"
پروفیسر والٹ نے تجربے کے بعد گھر میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی وہ جیسے ہی ٹی وی لاؤنج میں پہنچے اس کے قدم جہاں تھے وہیں کے وہیں رک گئے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ بس اس کے منہ سے صرف "میری" کی آواز نکل سکی۔ ٹی وی کے عین سامنے ایک بچی کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی اور ٹی وی سے شوں شوں کی آوازیں آرہی تھیں جیسے کہ اس میں کوئی نقص پیدا ہوگیا ہو۔ "نہیں یہ میری نہیں یہ میری نہیں ہوسکتی" وہ بڑبڑایا مگر پھر جیسے ہی اس کی نظر سامنے میز پر پڑے ہوئے میری کے ننھے منے اور خوبصورت بستے پر پڑی وہ بدحواسی کے عالم میں میری کی جلی ہوئی لاش سے لپٹ گیا۔

والٹ نے دنیا کو تو اپنے تجربہ کے متعلق سب کچھ بتادیا تھا مگر اپنی پیاری بچی کو مصروفیت کے باعث وہ کچھ نہ بتا سکا تھا۔ اس کی یہ کوتاہی میری کے لئے جان لیوا ثابت ہوچکی تھی۔ اس تجربہ کے بعد والٹ پوری دنیا میں مشہور ہوگیا مگر اس کے بعد وہ کبھی بھی اپنی پیاری بیٹی کو گود میں لے کر پیار نہ کرسکا۔

درخت

مرسلہ:۔ محمد نوید رحمانی۔ لاہور

کسی بھی ملک کی ترقی میں جنگلات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماہرین کی رائے میں ایک مستحکم ملک میں درختوں کا تناسب ۲۵ فیصد تک ہونا چاہئے۔ جو کہ ہمارے ملک میں بہت کم ہے۔ یہ تناسب ملکی معیشت اور ترقی کے لئے ناکافی ہے۔ غیر ممالک میں نہ صرف جنگلات ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں بلکہ وہاں لاکھوں سال پرانے عجیب و غریب قسم کے درخت موجود ہیں۔ امریکہ میں تین ہزار سال سے قائم صنوبر کا درخت تقریباً تین سو فٹ اونچا ہے اور اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کیلی فورنیا کے نیشنل پارک میں ایک اتنا بڑا درخت ہے کہ اگر اس کی لکڑی کاٹ کر دیا سلائی بنائی جائے تو دنیا کے تقریباً ہر شخص کو ماچس کی ایک ڈبیا مل جائے۔

امریکہ میں ٹیولپ نامی ایک قدیم پھولدار درخت موجود ہے جو لاکھوں سال سے نسل در نسل چلا آرہا ہے۔ دنیا کے قدیم درختوں میں افریقہ میں پایا جانے والا "یوباب" نہایت کار آمد ہے جس پر کدو نما پھل لگتا ہے۔ لوگ اس کا پھل بڑے شوق سے کھاتے ہیں اور اس کی چھال سے دوا بناتے ہیں۔ شمالی امریکہ میں پایا جانے والا درخت ساس فراس عجیب قسم کا ہے جس کی پتیاں تین مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ شکلیں ایک ہی درخت اور شاخ پر ہوتی ہیں۔ اسی قسم کا فار تھکس نامی ایک اور درخت ہے جس کی شاخیں صبح، دوپہر اور شام رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ بڑ کا درخت جو زیادہ تر پاک و ہند میں پایا جاتا ہے دنیا کے تمام درختوں سے مختلف

ہے۔ اس کی شاخیں بہت دور تک پھیلتی ہیں اور جڑیں زمین کے بہت اندر تک ہوتی۔ ہیں لوگ اسے داڑھی والا درخت بھی کہتے ہیں۔ اس درخت کے بارے میں مشہور ہے کہ سکندر اعظم کے زمانے میں ایک جنگ کے موقع پر اس کی آٹھ ہزار کی فوج نے اس کے سائے تلے آرام کیا تھا۔

دنیا میں بے شمار قسم کے درخت موجود ہیں یورپ میں پایا جانے والا "بوتل ٹری" اپنی ہیئت کے لحاظ سے مشہور ہے۔ دور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی بہت بڑی بوتل میں پھول اور پتے سجائے گئے ہیں۔ درخت جہاں ہمارے لئے پھل پھول سبزیاں اور ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتے ہیں وہاں ان کے بے شمار اور فائدے بھی ہیں۔ ان کی لکڑی سے فرنیچر، کھیلوں کا سامان اور کئی قسم کے دوسرے آلات و اوزار حاصل کئے جاتے ہیں۔ درختوں کی لکڑی سے گندہ بیروزہ اور ربڑ حاصل کیا جاتا ہے بعض درختوں میں سفید رنگ کا رس ہوتا ہے جس سے کھانے پینے کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں جب کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا تو لوگ درختوں کی چھال اور پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ناریل، کھجور اور بانس کے درخت سب سے زیادہ کار آمد ہیں جن سے ہم بادبان، تیل، لکڑی، پنکھیاں، سرکہ، چٹائیاں، کشتیاں، ٹوکریاں، جنگلے، چھپر، فرنیچر، کھلونے، گانے بجانے کے آلات، ڈول، پھل، کپڑا، ٹوپیاں، پاؤڈر، قہوہ اور کھانے پینے کی بے شمار دوسری اشیاء حاصل کرتے ہیں۔

اقوال زریں

ستارہ انجم شیخ ..... ٹنڈو آدم

☆ خوش مزاج انسان ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے۔

☆ دشمن کو دل کی مہربانی اور احسان سے جیتو اور دوستوں کو نیک سلوک سے۔

☆ علم انسان کی تیسری آنکھ ہے۔

☆ دوسروں کے چراغ سے روشنی ڈھونڈنے والے ہمیشہ اندھیرے میں رہتے ہیں۔

☆ مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔

☆ جس کے ساتھ تم ہنستے ہو اسے بھول سکتے ہو لیکن جس کے ساتھ تم روئے ہو اسے نہیں بھول سکتے۔

بند ڈبے میں کیا تھا؟

علی گوہر ــــ کراچی

یہ واقعہ آج سے ایک سال پہلے کا ہے۔ میں اور میرا دوست عدنان کھانا کھانے کے بعد باہر نکلے اور پھر اپنے علاقے میں ٹہلنے لگے۔ یہ ہمارا روز کا معمول تھا کہ ہم ٹہلتے تھے۔ جیسے ہی میں آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک ڈبہ رکھا ہوا ہے۔ میں نے عدنان کو اپنے پاس بلایا۔ اب جو اس نے دیکھا تو مجھ سے کہا

"ارے بھائی بھاگ چلو پتا نہیں کیا ہو؟ کیا پتا اس میں کوئی بم وغیرہ ہو۔" میں نے کہا "نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے" اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں جلدی سے گھر واپس آیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد میں اور عدنان دونوں اس ڈبے کے چاروں طرف چاک سے خطرہ لکھ رہے تھے۔ یہ ایسی گلی تھی کہ یہاں سے بہت کم لوگ گزرتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہاں سناٹا رہتا تھا۔ اب میں نے عدنان سے کہا "چلو یار اب ارشد کے پاس چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی ہمارے ساتھ وہاں پر کھڑا تھا۔ میرا دل پوری رفتار کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔

میں نے ارشد سے کہا "ارے ایک تمہارے کوئی بھائی بھی تو ہیں پولیس میں۔؟" ایک تو تم یہ بتاؤ کہ تم میرے بھائی کے پیچھے کیوں لگے رہتے ہو؟" ارشد زور سے بولا پھر تھوڑی دیر بعد ارشد اپنے بھائی کو لے آیا۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا کہ "بیٹا اس کے قریب نہ جانا پتا نہیں کس تخریب کار نے یہ کام کیا ہے۔" کچھ وقت اور گزرا تو وہ اپنے ایک اور دوست کو بلا لائے اب تو جناب جو کوئی بھی وہاں سے گزرتا وہیں رک کر یہ تماشا دیکھنے کے لئے رک جاتا۔ انہوں نے ڈبے کو آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا جیسے جیسے ڈبہ کھل رہا تھا ویسے ویسے میری دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عدنان تو ایسا لگ رہا تھا کہ اب گرا کہ تب گرا۔ ارشد کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا پھر دوسری ٹانگ پر۔ ڈبا کھل چکا تھا۔ اب جو ہماری نظریں ڈبے پر پڑی تو ہم شرمندگی سے زمین میں گڑ گئے۔ کیوں کہ اس ڈبے سے ایک بلی کا بچہ نکل کر بھاگا۔ اب چاروں طرف قہقہے لگ رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔" میں نے کہا "چوہا نہیں بلی کا بچہ" میرے اس فقرے پر وہاں موجود سب لوگ ہنس دیئے۔ گمان ہے کہ اس وقت وہاں موجود سب لوگوں کے ذہن میں محلے کے ان شریر بچوں کی تصاویر ابھر رہی ہوں گی جو اس شرارت کے ذمے دار تھے۔

محنت کا پھل

محمد حامد بلال، ڈگ روڈ

جو محنت سے گھبراتے تھے
جو پڑھنے سے کتراتے تھے
جو ناحق وقت گنواتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

جو کاہل کھیلا کرتے تھے
مکتب میں جھیلا کرتے تھے
جو پاپڑ بیلا کرتے تھے
وہ فیل ہوئے، ہم پاس ہوئے

جو راہِ عمل کے رہزن تھے
بے راہ روی کے مسکن تھے
جو علم و ہنر کے دشمن تھے
وہ فیل ہوئے، ہم پاس ہوئے

جو قصداً ناغہ کرتے تھے
جو چھٹی کا دم بھرتے تھے
جو ہم پر تہمت دھرتے تھے
وہ فیل ہوئے، ہم پاس ہوئے

ہر شخص سُنے یہ افسانہ!
وہ اپنا ہو یا بیگانہ
جو کہتے تھے ہمیں دیوانہ
وہ فیل ہوئے، ہم پاس ہوئے

کامیابی کا راز

مرسلہ..... سید سلیم الحق

ایک بادشاہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اسے کامیابی کا راز معلوم ہو جائے۔ تاکہ جب وہ کوئی کام کرے تو اس میں اسے ناکامی نہ ہو۔ اس کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لئے اس نے تین سوالات منتخب کئے۔ وہ سوالات یہ تھے۔

(۱) کوئی کام کرنے کے لئے سب سے اچھا وقت کون سا ہے ؟

(۲) سب سے بہتر کام کونسا ہے ؟

(۳) اور سب سے اہم شخصیت کس کی ہے ؟

بادشاہ نے وزیر اعظم سے اعلان کروا دیا کہ جو شخص ان سوالات کے جوابات دے گا اسے ۵ ہزار دینار دیئے جائیں گے۔ بہت سے لوگ آئے مگر بادشاہ کسی کے بھی جوابات سے مطمئن نہ ہو سکا۔ اس شہر میں ایک عقلمند آدمی رہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ خود ان سوالات کے جوابات ڈھونڈے۔ دار الخلافہ کے قریب ہی ایک جنگل واقع تھا۔ اس جنگل کے اندر ایک عقلمند بوڑھا رہتا تھا۔ بادشاہ اس بزرگ کے بارے میں جانتا تھا، اور اس سے سوالات کے جواب چاہتا تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا کہ وہ بوڑھا امیر لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ان سے میل جول نہیں رکھتا تھا۔ مگر غریب لوگوں کا وہ دوست تھا۔ آخر کار بادشاہ نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے پھٹے پرانے کپڑے پہن لئے اب وہ ایک فقیر دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ وہ بزرگ کی جھونپڑی سے ذرا دور رہیں تاکہ بزرگ انہیں دیکھ نہ سکے۔ جب بادشاہ بزرگ کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بزرگ اپنی جھونپڑی کے سامنے میدان کی کھدائی کر رہے ہیں۔ وہ بڑی محنت سے کام کر رہے تھے۔ مگر بڑھاپے کی وجہ سے بار بار تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بزرگ کے پاس پہنچا اور کہا۔ "جناب میں ایک لمبی مسافت طے کر کے آیا ہوں اور اپنے تین سوالات کے جوابات چاہتا ہوں۔" میرا پہلا سوال یہ ہے کہ "سب سے اہم وقت کوئی سا بھی کام کرنے کے لئے کونسا ہے" ؟ میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ "سب سے اہم کام کونسا ہے" ؟ اور میرا آخری سوال یہ ہے کہ "سب سے اہم شخصیت کونسی ہے" ؟ کیا آپ مہربانی فرما کر میرے ان سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں" مگر بزرگ نے بادشاہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کھدائی کرتے رہے۔ بادشاہ نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر کہا۔ "جناب آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لائیے اب میں کھدائی کرتا ہوں۔" بزرگ نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے کدال دے دی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی مگر اس دفعہ بھی

بزرگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر بادشاہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور شام تک کھدائی کرتا رہا۔ شام کو ایک بار پھر بادشاہ نے اپنی بات دہرائی مگر بزرگ نے جواب دینے کے بجائے اپنی انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی انگلی کی سمت میں دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک داڑھی والا بوڑھا شخص ان دونوں کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک اینٹ ہے جب وہ ان کے پاس پہنچا تو زمین پر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ بادشاہ اس بوڑھے کو جھونپڑی میں لے گیا۔ بوڑھا بہت زخمی تھا۔ اس نے بوڑھے کی مرہم پٹی کی۔ مرہم پٹی کی وجہ سے بوڑھا جلد ہی سو گیا جب رات کا وقت ہوا تو بادشاہ بے حد تھک چکا تھا اور واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بزرگ نے بادشاہ کو رات ٹھہرنے کی دعوت دی۔ بادشاہ نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ بزرگ نے بادشاہ کو کچھ کھانا اور ایک نرم چھال کا بستر دیا۔ بادشاہ ایسا سویا کے دوسرے دن دوپہر کو اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بوڑھا اب اٹھ چکا تھا۔ "آپ اب کیسے ہیں؟"

بادشاہ نے پوچھا تو بوڑھے نے جواب دیا۔ "میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کا شکریہ۔ مجھے معاف کر دیں میں آپ کو قتل کرنے آرہا تھا کیونکہ آپ نے میرے بھائی کو مروا دیا تھا۔ میں اس دن سے آپ کا بدترین دشمن بن گیا تھا۔ میں آپ کے جانے کا انتظار کر رہا تھا مگر جب آپ واپس نہیں گئے تو میں جہاں چھپا ہوا تھا وہاں سے نکل آیا۔ آپ کے نوکروں نے مجھے دیکھ لیا اور زخمی کر دیا۔ آپ مجھے اپنے وفادار ملازموں میں شامل کر لیں۔" بادشاہ نے اس کی بات مان لی اور اپنا ملازم رکھ لیا۔ جب بادشاہ اور بوڑھا آدمی جانے لگے تو بادشاہ نے بزرگ سے ایک بار پھر اپنے سوالات کے جوابات پوچھے تو بزرگ نے کہا۔ "سب سے اہم وقت وہ تھا جب تم نے میری مدد کرنا چاہی تھی۔ سب سے اہم کام میدان کی کھدائی کا تھا۔ اور میں تمہارے لئے سب سے اہم شخصیت تھا کیونکہ اگر میں تمہیں نہ روکتا تو تم جان سے جاتے۔ دوسری مرتبہ سب سے اہم شخصیت بوڑھا آدمی تھا اور سب سے اہم کام اس کی مرہم پٹی کا تھا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو ایسا وفادار ملازم حاصل نہیں کر سکتے تھے تم بہت خوش قسمت ہو۔" دراصل بزرگ کے پہلے جواب کا مطلب تھا کہ سب سے اہم وقت کسی کام کے کرنے کے لئے زمانۂ حال ہے۔ دوسرے جواب کا مطلب تھا کہ سب سے اہم کام وہ ہے جو ہم اس وقت کر رہے ہیں۔ تیسرے جواب کا مطلب تھا کہ سب سے اہم شخصیت وہ ہے جو اس وقت تمہارے ساتھ ہے۔ بادشاہ تمام باتوں کا مطلب سمجھ چکا تھا اور خوش تھا کہ وہ کامیابی کا راز معلوم کر چکا ہے۔

عجائبات عالم

مرسلہ :۔ سلطانہ خلیل

بادشاہوں کا گرجا

دنیا میں ایک گرجا ایسا بھی ہے جہاں اسکاٹ لینڈ کے ۴۸، ناروے کے ۸، آئرلینڈ کے ۴ اور فرانس کے بھی

۴ بادشاہوں کی قبریں ہیں۔ دنیا میں اور کسی قبرستان یا گرجے میں اتنے زیادہ بادشاہوں کی قبریں نہیں ہیں۔

خدا کی قدرت

۱۷۹۳ء میں فرانس کے مکیمنٹ (مکی مینٹ) خاندان میں ایک ایسی بچی پیدا ہوئی جس کی صرف ایک آنکھ تھی۔ وہ بھی پیشانی کے وسط میں لگی ہوئی تھی لڑکی بالکل صحت مند تھی اور وہ ۱۵ سال کے عرصہ تک زندہ رہی۔

حیرت انگیز صلاحیت

امریکہ کا ۲۰ واں صدر جیمز گارفیلڈ بعض حیریت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی ایک صلاحیت یہ بھی تھی کہ وہ بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے لکھنے کی قدرت رکھتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ یہ بھی قدرت رکھتا تھا کہ بیک وقت ایک ہاتھ سے لاطینی اور دوسرے ہاتھ سے یونانی زبان لکھ سکے۔

بڑے لوگوں کی تاریخِ وفات

مرسلہ..... علی حسن لغاری..... ماتلی

نام شخصیتیں	تاریخ	سن وفات
بوعلی سینا	۳۱ جون	۱۰۳۷ء
امام شافعیؒ	۷ جولائی	۸۲۰ء
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	۴ فروری	۱۱۶۶ء
علامہ اقبالؒ	۲۱ اپریل	۱۹۳۸ء
لیاقت علی خان	۱۶ اکتوبر	۱۹۵۱ء
قائداعظمؒ	۱۱ ستمبر	۱۹۴۸ء
جلال الدین اکبر	۱۷ اکتوبر	۱۶۰۵ء
مولوی اسماعیل میرٹھی	۱ نومبر	۱۹۱۷ء
نواب محسن الملک	۱۶ اکتوبر	۱۹۰۷ء
خواجہ حسن نظامیؒ	۳۱ جولائی	۱۹۵۵ء

کہاوتیں

مرسلہ:۔ خالد خلیل۔ کراچی

۱..... اپنے اسلاف کو بھول جانے والا اس چشمے کی مانند ہے جس کا کوئی دھانہ نہ ہو یا اس درخت کی طرح جس کی کوئی جڑ نہ ہو۔ (چینی کہاوت)

۲ ..... محبت آمیز سلوک کی بندش قرض سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ (روسی کہاوت)

۳..... اگر تمہاری کوئی چیز تمہارے دوست کو مل جائے تو اسے کھویا ہوا محسوس نہ کرو۔ (یورپی کہاوت)

۴..... اچھے الفاظ کہنے والے کے الفاظ پر غور کرو نہ کہ اس کی ذات پر (جاپانی کہاوت)

۵..... تھوڑا سا منافع کمانا تجارت میں ناکام رہنے سے بہتر ہے۔ (جاپانی کہاوت)

۶..... انسان کو بلندی پر لے جانا مشکل ہے گرا دینا دشوار نہیں۔ (رومی کہاوت)

۷ ..... زندگی ایک متحرک سایہ ہے۔ (برطانوی کہاوت)

۸..... خدا پر اعتقاد کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ (یونانی کہاوت)

۹ ..... دانا دل کی آنکھ سے وہ کچھ دیکھتا ہے جو جاہل اپنی ظاہری آنکھ سے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ (جاپانی کہاوت)

۱۰..... تجربہ وہ کنگھی ہے جو زندگی ہمیں ایسے وقت دیتی ہے جب ہمارے بال جھڑ جاتے ہیں۔ (بلجیئم کی کہاوت)

۱۱..... الفاظ کے پیچھے مت بھاگو۔ بلکہ خیالات تلاش کرو۔ جب خیالات کا ہجوم ہوگا تو الفاظ خود بخود مل جائیں گے۔ (یونانی کہاوت)

۱۲..... نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقل مندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف اسے قبول نہیں کرتے۔ (عربی کہاوت)

۱۳..... جہاں صداقت اور خلوص نظر آئے وہاں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ ورنہ تمہاری تنہائی ہی تمہاری بہترین رفیق ہے۔ (ایرانی کہاوت)

۱۴..... بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔ (اسپین کی کہاوت)

تو پھر میں کہاں جاؤں؟

تمثال مسعود لکھنؤ (بھارت)

اف! گرمی بہت ہو رہی تھی۔ میرا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں دوڑ کے گھر کے اندر چلا گیا۔ گھر کی زمین کچی ہونے کی وجہ سے اس میں ہلکی ہلکی ٹھنڈک اور سوندھا پن تھا۔ میں اسی پر بیٹھ گیا اور نرم زمین کو اپنی چھوٹی چھوٹی انگلی سے کریدنے لگا۔ اس پر میری ماں نے مجھے ڈانٹا۔ میں کونے میں پڑی ہوئی تھوڑی سے مٹی پر پانی ڈال کر اسے ملانے لگا۔ جب دونوں چیزیں مل گئیں تو میں اس سے چیزیں بنانے لگا۔ میں نے اپنی ماں کو باپو سے کہتے سنا کہ وہ میرا نام پاٹھ شالا اسکول میں لکھا دیں۔ میرا پاٹھ شالا جانے کو قطعی دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن باپو کی مار سے میں چپ رہا۔ ماں مجھے تیار کر رہی تھی۔ میرا منہ لٹکا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں میں ماں کے ساتھ پاٹھ شالا کی طرف روانہ ہوا۔ ہم لوگ ایک پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پاٹھ شالا پہنچ کر باپو نے مجھے ماسٹر صاحب سے ملایا، اس وقت وہ مجھے بہت خراب آدمی معلوم ہو رہے تھے، لیکن بعد میں مجھے وہ اچھے لگنے لگے۔ وہاں میرے کئی دوست ہو گئے تھے جن کے ساتھ میں چھٹی کے بعد گھومنے جایا کرتا تھا۔ ہم لوگ آم کے باغ، گنّوں کے کھیتوں میں گھومنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ ہم تینوں میلے کچیلے کپڑے پہنے کبھی ندی میں نہاتے ہیں، کبھی باغوں سے آم، امرود کھاتے ہیں۔ گنوں کی فصل میں گنے کھاتے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے۔ کتنا مزا تھا ان دنوں وہ دن مجھے شاید ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ان دنوں کا مقابلہ میں ان دنوں سے کرتا ہوں تو مجھے بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ وہ کھلے میدان میں بڑے بڑے درخت پر چڑھنا، ندی میں نہانا، گلی ڈنڈا کھیلنا، کتنا مزا آتا تھا۔ لیکن اب میں بڑا ہو گیا ہوں اس لئے ان مزوں کو حاصل نہیں کر پاتا ہوں اور پھر یہ تو شہر ہے یہاں نہ تو ویسے میدان ہیں نہ باغ۔ تو کیا۔ یہاں پارک ہیں۔ ان میں وہ تازی خوشبو نہیں آ سکتی، جھولے ہیں لیکن ان میں وہ مزا نہیں جو درختوں میں لٹکنے کا تھا۔ اس کچی مٹی کے بنے سوندھے گھر کی جگہ یہ پکی اینٹوں کا بنا مکان نہیں لے سکتا۔ ان میلے کپڑوں کی جگہ یہ سفاری سوٹ نہیں لے سکتے۔ ان مزوں کو میں اب شاید کبھی نہیں حاصل کر پاؤں گا۔ میں یہی سوچتا رہتا تھا اور اداس رہا کرتا تھا۔ آخر ایک دن وہ آیا جب میں نے گاؤں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میں گاڑی میں سوار ہو کر گاؤں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ جب میں گاؤں پہنچا تو وہاں مجھے اتنا مزا نہیں آیا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بیل گاڑی

میں بیٹھنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے کافی تکلیف سہنا پڑی اور رات میں مچھروں سے تو میں اتنا عاجز ہو گیا تھا کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ واپس شہر چلا جاؤں۔ اتنی گرمی اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی، نہ بجلی نہ صاف پانی۔ سڑک پر کیچڑ۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے گاؤں میں رہنے کی عادت نہیں رہی اور میں وہاں سب کے کہنے پر صرف دو دن رک کر واپس آگیا، اور اب میرا گاؤں جانے کے لئے دل نہیں چاہتا ہے۔ اور افسوس کہ شہر میں بھی میرا دل نہیں لگتا۔

معلومات آقائے دو جہاں

مراسلہ ..... نائلہ بختیار۔ کوھاٹ

○ ..... حضورؐ کی نماز جنازہ کی امامت کسی نے نہیں کی۔

○ ..... حضورؐ کا انتقال پیر کے روز ہوا۔ آپؐ کی تدفین مبارک منگل کو ہوئی۔

○ ..... انتقال کے وقت حضورؐ کا سر مبارک حضرت عائشہؓ (زوجہ مطہرہ) کی گود میں تھا۔

○ ..... وفات سے قبل حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابو بکر نے مسواک چبا کر نرم کرنے کے بعد آنحضرتؐ کو دی تھی۔

○ ..... آنحضرت کی زبان مبارک پر آخری الفاظ بل الرفیق الاعلیٰ تھے۔ آپؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دھرائے تھے۔

○ ..... حضورؐ کو غسل دینے کی سعادت حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو نصیب ہوئی۔ آپؐ کی قبر مبارک حضرت ابو طلحہؓ نے کھودی۔

○ ..... غزوہ تبوک حضورؐ کا آخری غزوہ تھا۔

○ ..... حضورؐ کی قبر مبارک خام اینٹوں سے تیار کی گئی تھی۔ حضورؐ کی قبر مبارک پر ۹ اینٹیں چنی گئی تھیں۔

○ ..... حضورؐ نے وصال کے وقت حضرت عائشہؓ کو سات دینار صدقہ دینے کا حکم دیا تھا۔

○ ..... حضورؐ ۱۸ دن بیمار رہے۔

○ ..... انتقال کے وقت حضورؐ کا سر مبارک حضرت عائشہؓ (زوجہ مطہرہ) کی گود میں تھا۔

○ ..... وفات سے قبل حضرت عبدالرحمٰنؓ بن ابو بکر نے مسواک چبا کر نرم کرنے کے بعد آنحضرتؐ کو دی تھی۔

(حوالہ کتاب ۔ خزانہ اسلامی معلومات۔ مصنف امتیاز علی)

دوسرا بھوت

محمد نوید رحمانی۔ لاہور

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم کرائے کے مکان میں نئے نئے آئے تھے۔ ہمارے گھر کے بالکل قریب ایک قبرستان تھا، اس لئے رات کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ایک دن ہم نے امی جان کو ابّا جان سے یہ کہتے ہوئے سنا، "میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ سڑک کے کنارے مکان لیجئے گا آپ نے ویرانے میں اور وہ بھی قبرستان کے قریب گھر لے لیا ہے۔ بچے بیچارے ہر وقت خوفزدہ رہتے ہیں، کہیں ڈر سے بیمار نہ ہو جائیں اور ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ قبرستان میں

جھوت ہوتے ہیں۔"

امی کی بات سن کر ابا جان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولے، "بھئی تم بھی کمال کرتی ہو، بھلا بھوتوں کی بھی کوئی حقیقت ہے۔ پھر وہ ہمارے گھر کیوں آئیں گے اور بھی تو بہت سے لوگ اس محلے میں رہتے ہیں۔" جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں ہم اور ہمارے بھائی جان وہیں قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہمارے ذہن نے ہمیں شرارت کی طرف ابھارا۔

رات بارہ بجے کے بعد ہم نے ایک سفید چادر لی اور قینچی سے اس میں دو سوراخ کئے پھر اس کو اپنے جسم پر اس طرح لپیٹا کہ سوراخ ہمارے چہرے پر آگئے، یوں ہم باہر کا منظر بھی دیکھ سکتے تھے۔ تیاری کے بعد ہم بھائی جان کے کمرے کی طرف چل پڑے، ابھی ہم اپنے کمرے سے نکلے ہی تھے کہ چونک پڑے۔ ہمارے سامنے بالکل ہمارے جیسا ایک بڑا بھوت کھڑا تھا۔ خوف سے ہماری گھگھی بندھ گئی، پھر جونہی دونوں بھوتوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ہمارے ساتھ ہی بڑے بھوت نے بھی چیخ مار دی۔ دوسرے ہی لمحے ہم ہوش و حواس کی دنیا سے دور جا چکے تھے۔ جب ہمیں ہوش آیا تو امی جان ہمارے پاس بیٹھی تھیں۔ ہم نے ان سے بھائی جان اور ابا جان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے بھائی اپنے کمرے میں بے ہوش پڑے ہیں، پتہ نہیں کیا بات ہے کہ تم دونوں بے ہوش ہوگئے۔ امی کی باتیں سن کر ہم چونک اٹھے۔ بات ہماری سمجھ میں آگئی تھی۔ ہم مسکراتے ہوئے بھائی جان کے کمرے کی طرف چل پڑے جہاں وہ ابھی تک بھوت والے لباس میں تھے۔ جونہی ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں ہمارے منہ سے قہقہے جھڑنے شروع ہوگئے۔ امی ابو حیرت سے ہمارا منہ تک رہے تھے، پھر جب ہم نے ساری تفصیل بتائی کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو بھوت بن کر ڈرانا چاہ رہے تھے تو ایک مرتبہ پھر کمرے میں قہقہے گونجنے لگے۔

پھول اور کانٹا

مرسلہ۔ اکرم سیال توقیر۔ ننکانہ صاحب۔

ایک بزرگ سے کسی نے دریافت کیا کہ "کیا وجہ ہے کہ لوگ گانوں وغیرہ کی محفلوں میں تو ساری رات بیٹھے رہتے ہیں اور ان کو نیند نہیں آتی۔ اس کے برعکس اگر پوری رات عبادت کریں تو نیند ستانے لگتی ہے۔"

بزرگ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا کہ "اگر تم لوگوں کو دو بستر دیئے جائیں جن میں سے ایک کانٹوں والا ہو اور دوسرا پھولوں والا ہو تو تمہیں کس بستر پر نیند آئے گی؟۔"

آدمی نے جواب دیا۔ "پھولوں والے بستر پر۔" بزرگ بولے۔ "بس یہی بات ہے۔ ناچ گانوں والی محفل کانٹوں والا بستر ہے۔ جس پر نیند نہیں آتی اور عبادت پھولوں کا بستر ہے۔ جس پر آتے ہی نیند آنے لگتی ہے۔"

نوٹس بورڈ

قارئین اور قلم کاروں سے ادارہ آنکھ مچولی
کے ماہانہ رابطے کا مستقل سلسلہ

معذرت

چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر بک مارک کا تحفہ اس شمارہ
کیساتھ شامل نہیں ہوسکا جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے
اِنشاءاللہ یہ تحفہ آئندہ شمارہ کیساتھ شامل ہوگا۔

جو ایسا ہو تو کیسا ہو؟

جو ایسا ہو تو کیسا ہو کہ ..... آپ کا پسندیدہ ماہنامہ آنکھ مچولی عام
شمارے کی قیمت میں قدرے کمی کے اعلان کے ساتھ ہی

- ○ ..... اپنے روایتی حسن اور خوبصورتی کو کم کردے
- ○ ..... اضافی رنگین صفحات کو یکسر ختم کردے .....
- ○ ..... آئے دنوں تحائف دیتے رہنے کی پالیسی ترک کردے
- ○ ..... صفحات میں بھی کچھ کمی آجائے

اور آنکھ مچولی مارکیٹ میں دستیاب
عام رسائل کی طرح کا ایک رسالہ بن جائے تو آپ کے خیال میں کیسا رہے گا؟
اپنی رائے سے آگاہ کیجئے

ہم منتظر ہیں

آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی نمبر ۱۶

بچّوں کا عالمی ترانہ

سلیم فاروقی

یہ ہیں چینی وہ جاپانی ہم افریقی تم افغانی
ریت دوئی کی اب ہے پُرانی کون سُنے یہ رام کہانی
بولو ہم سب بھائی بھائی

لوگو! سُن لو بات ہماری گھر ہے ہمارا دُنیا ساری
اس گھر کی ہر چیز ہے پیاری چوکھٹ، دروازے الماری
بولو ہم سب بھائی بھائی

کوہ و سمندر، دریا، اپنے چشمے، جھیل، تلیّا اپنے
وادی، گلشن، صحرا اپنے ہم سب کے سب بھیّا اپنے
بولو ہم سب بھائی بھائی

ہم امن و اُلفت کے پجاری جنگ و جدل ہے اِک بیماری
کب سمجھیں گے بات ہماری ہیں جو بچارے عقل سے عاری
بولو ہم سب بھائی بھائی

علم کی خُوشبو پھیلائیں گے بات عمل کی سمجھائیں گے
نقش جہالت مٹ جائیں گے جب یہ ترانہ ہم گائیں گے
بولو ہم سب بھائی بھائی

ستمبر میں اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی دنیا بھر کے بچّوں کی کانفرنس کے موقع پر
بچّوں کے عالمی اتحاد اور باہمی محبّت کے حوالے سے ایک خوبصورت نظم

اس ماہ آپ کو آنکھ مچولی کیسا لگا ؟

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ

آنکھ مچولی کو معیاری تحریروں کے حسن سے

آراستہ کر کے آپ تک پہنچائیں

تاہم آپ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا

اور آپ کی آراء کی روشنی میں آنکھ مچولی کو خوب سے خوب تر بنانا ہی ہمارا مقصد ہے

اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہماری مدد کیجئے

ہمیں بتائیے کہ ..... اس ماہ آپ کو

..... آنکھ مچولی میں سب سے بہترین تحریر کون سی لگی ؟

..... آپ کے خیال میں کمزور ترین تحریر کون سی تھی

تمام تحریروں کو پسندیدگی کے اعتبار سے ترتیب دیجئے

اور ہمیں لکھ بھیجئے ..... آپ کی رائے ..... آنکھ مچولی

کے معیار میں بہتری کی سمت ہماری معاون ہوگی

گیلپ ٹینڈر

پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز اسلام آباد کو ایمرجنسی ڈیزل جنریٹر سیٹ (درآمد شدہ) کی سپلائی اور انسٹالیشن کے لئے ٹینڈر مطلوب ہے۔ سیٹ کی بجلی بنانے کی استعداد ۳۰۰ کے وی اے ۳ فیز، اے سی ہو جو ۴ تار، ۵۰ سائیکل او بی پاور فیکٹر، ۶۰۰۔ ۴۰۰ وولٹ سسٹم پر انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز ۳/۸۔ جی اسلام آباد میں بجلی کی ضروریات کے لئے موزوں ہو۔

کام کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ فرم جدید اور اول درجے کی ساکھ کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ صرف ڈیزل جنریٹر سیٹوں کی تجارت کرتی ہو۔ فرم کے لئے درج ذیل شرائط پر پورا اترنا ضروری ہے۔

(۱) اچھی مالی حیثیت

(۲) اسی طرح کے کاموں کی تفصیلات

(۳) فرم کا تکنیکی اسٹاف

(۴) مشینری کی تفصیلات

(۵) انکم ٹیکس رجسٹریشن م ینرنس سرٹیفکیٹ

(۶) آربٹریشن اور لٹگیشن کے کیسوں کی فہرست

تمام کام بشمول فراہمی و تعمیر اور متعلقہ الیکٹرک کام معاہدے پر دستخط ہونے کے ۳۰ دن کے اندر لازماً مکمل ہو جانا چاہئے۔

ٹینڈر، تفصیلات کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے دفتر سے ۲۰ اگست سے ۲۵ اگست ۱۹۹۰ء کے درمیان ۵۰۰ روپے (ناقابل واپسی) فیس دے کر حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ ٹینڈر ۲۶ اگست ۱۹۹۰ء کو ٹھیک بارہ بجے دوپہر تک جمع ہو جانے چاہئیں۔ یہ ٹینڈر اسی روز ۳۰۔ ۱۲ پر کھولے جائیں گے۔

پی آئی ایم ایس کو حق ہے کہ وہ کسی ایک یا تمام ٹینڈروں کو بغیر کوئی وجہ بتائے رد کر دے۔

(ڈاکٹر۔ آصف محمود)
اسسٹنٹ ڈائریکٹر
پی آئی ایم ایس

جی ۳/۸ اسلام آباد

پی آئی ڈی ،، / ۶۴۷

حکومت پاکستان
منسٹری آف ہاؤسنگ اینڈ ورکس
(ماحولیات اور شہری امور ڈویژن)

حکومت پاکستان ماحولیات اور شہری امور ڈویژن کو پاکستان کے شہریوں کی جانب سے درج ذیل عارضی آسامیوں کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

نمبر شمار۔	عہدے، نام اور گریڈ	تعداد عہدہ	تعلیمی اہلیت	ڈومیسائل	عمر
	اسٹینو گرافر				
۱	(بی پی ایس۔ ۱۵)	۱	انٹرمیڈیٹ ٹائپنگ میں پچاس الفاظ منٹ اور شارٹ ہینڈ میں اور ایک سو الفاظ فی منٹ رفتار ہونی چاہئے	سندھ (دیہی)	۱۸۔۲۵ سال سرکاری ملازم ہونے کی صورت میں زائد عمر کی چھوٹ دی جائے گی
	اسٹینو ٹائپسٹ				
۲	(بی پی ایس۔ ۱۲)	۴	میٹرک، ٹائپنگ میں چالیس الفاظ فی منٹ اور شارٹ ہینڈ میں اسی الفاظ فی منٹ رفتار ہونی چاہئے	فنا/ فنا ۱ سندھ (دیہی) ۱ پنجاب ۲ (اس میں پنجاب کوٹہ سے ڈپوٹیشن پر آکر کام کرنے والا شامل ہے)	"
	ایل ڈی سی				
۳	(بی پی ایس ۵)		میٹرک ٹائپسٹ کی رفتار		
		۱	۳۰ الفاظ فی منٹ	پنجاب	"

۲۔ درخواستیں بشمول نام، والد کا نام، تعلیمی اہلیت، تجربہ، ڈومیسائل وغیرہ کے ہمراہ پاسپورٹ سائز تصویر، تعلیمی اسناد، تجربہ، قومی شناختی کارڈ کی تصدیق شدہ نقول کو ماحولیات اور شہری امور ڈویژن کمرہ نمبر ۵۱۴، شہید ملت سیکرٹریٹ بلیو ایریا ایف ۶/۱ اسلام آباد کے پتے پر ۹ اگست ۱۹۹۰ء تک ارسال کر دی جائیں۔ موزوں درخواست گزار امیدواروں کو ٹیسٹ/انٹرویو کے لئے بلایا جائے گا۔ مطلوبہ دستاویزات کے بغیر اور مقررہ تاریخ کے گزر جانے کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ انٹرویو/ٹیسٹ کے لئے کوئی ٹی اے/ڈی اے نہیں دیا جائے گا۔ سرکاری ملازمین تھرو پراپر چینل درخواستیں دے سکتے ہیں۔

عبدالحبیب عباسی
سیکشن آفیسر
ٹیلی فون ۸۱۰۵۰۴

پی آئی ڈی ۲۵۲/۶۲

SSGC

Sui Southern Gas Co. Ltd.

ٹینڈر نوٹس

بدین گیس فیلڈز انٹگریشن پروجیکٹ

ٹینڈر انکوائری نمبر پی اینڈ ڈی / بی جی ایف آئی پی / ۰۷ ریپیٹر اسٹیشن جھمپیر و رن پٹھانی پر چین لنک فینس کی تعمیر۔

سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ (ایس ایس جی سی ایل) (سوئی گیس ٹرانسمیشن کمپنی لمیٹڈ اینڈ سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ) یونٹ سی اپنے ریپیٹر اسٹیشنوں ۴۔ ایس آر (جھمپیر) اور ۵۔ ایس آر (رن پٹھانی) پر جو کہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر سولہ انچ قطر کی پائپ لائن کے ساتھ واقع ہیں چین لنک فینس تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

تعمیراتی کمپنیوں کو جو اس طرح کے کاموں کا تجربہ رکھتی ہوں اور جو موزوں افرادی قوت، مشینری و آلات و سامان کی حامل ہوں، دعوت دی جاتی ہے کہ ٹینڈر انکوائری میں درج شرائط و ضوابط کے مطابق اس کام کی تکمیل کے لئے ٹینڈر دیں۔ ٹینڈر دینے والوں کو ٹھیکہ کی خاطر کوالی فائی کرنے کے لئے کوالی فکیشن کے بعد کی ان ضروریات کی تکمیل کرنی ہوگی جن کی تفصیلات ٹینڈر انکوائری میں درج ہیں۔

ٹینڈر انکوائری کی دستاویزات ۱۷ اگست ۱۹۹۰ء سے ایس ایس جی سی ایل (یونٹ سی) پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ سے جو کہ پہلی منزل شیخ سلطان ٹرسٹ بلڈنگ، بیومونٹ روڈ کراچی میں واقع ہے صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک ناقابل واپسی رقم دو سو ۲۰۰ روپے (بہ شکل بینک ڈرافٹ / پے آرڈر بنام سوئی سدرن گیس کمپنی لمیٹڈ یونٹ سی) جمع کر کے، حاصل کی جاسکتی ہیں۔

تمام ٹینڈر پہلی منزل شیخ سلطان ٹرسٹ بلڈنگ بیومونٹ روڈ کراچی میں واقع پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ کے دفتر میں ۱۰ ستمبر ۱۹۹۰ء کو یا اس سے قبل تین بجے سہ پہر تک وصول کئے جائیں گے اور اسی دن تین بجکر دس منٹ پر موجود رہنے کے خواہشمند ٹینڈر دینے والوں یا ان کے مقرر کردہ نمائندوں کے سامنے کھولے جائیں گے۔

پی آئی ڈی (1)

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جا بجا کوپن چھاپنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____ کلاس _____ عمر _____

ارسال کردہ کل رقم _____ بذریعہ _____ دستخط _____

پتا _____

_____

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____ کلاس _____

پتا _____

جواب نمبر ① _____ ② _____ ③ _____ ④ _____ ⑤ _____

⑥ _____ ⑦ _____ ⑧ _____ ⑨ _____ ⑩ _____

نام _____ عمر _____ جماعت _____

مشاغل _____ پسندیدہ مضمون _____

کوئی اہم کامیابی _____

پتہ _____

روشن مثال

ان ساتھیوں کا تعارف

جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

چونکہ "سالگرہ کے ساتھی" اپنے اختتام کو پہنچا اس لئے ہم اس ماہ سے نیا سلسلۂ تعارف "روشن مثال" کے عنوان سے شروع کر رہے ہیں۔ اس نئے تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک ہو سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً ۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ.....

○ ..... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ..... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جا رہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو BEST OF MONTH کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جا سکے۔

○ ...... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہوسکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ...... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۴۷ پر موجود ہے۔

سراج امان اللہ
ساتویں، رسائل
پڑھنا کرکٹ کھیلنا
اردو

اسلامک کوئز میں اوّل پوزیشن

دیوان بالا
بلڈنگ میٹھادر ۱۱۶، سی ٹی، کراچی

سید محمد علی شاہ بخاری
۱۸ سال، سی کام
ٹکٹ اور پرانے
نوٹ جمع کرنا،
معاشرتی علوم

میٹرک میں اے ون گریڈ

پوسٹ بکس نمبر
۱۳۴۱ ۔ جی پی او پشاور صدر

مجاہد عبدالقیوم
۱۷ سال
نہم (اے)، دینی کتب
کا مطالعہ، اسلامیات

ہشتم میں دوسری پوزیشن

مکان نمبر جی ۲۲
زچہ خانہ روڈ حیدرآباد، سندھ، پوسٹ بکس ۷۱۰۰۰

ارشاد علی
۱۴ سال
ہشتم، کرکٹ، مطالعہ
حساب

ساتویں میں اوّل پوزیشن

شفیق کالونی
فیڈرل بی ایریا اسکیم نمبر ۱۶ بلاک نمبر ۲۲ کراچی ۳۸
سلیم جنرل اسٹور والے کو مل کر ارشاد علی کو ملے

آغا نعمان علی نومی
۱۴ سال
نویں، ٹکٹ، سکے
جمع کرنا، مطالعہ کرنا،
اردو

ساتویں میں اوّل پوزیشن

مکان نمبر
۹۳۲ ۔ گلزار گلی شاہی بازار حیدرآباد

آپ کی تصویر اس فریم کے سائز میں کٹی ہوئی ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا بڑی تصویر قابلِ قبول نہ ہوگی

امّی ابّو کا صفحہ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

ام رمیصاء

ہم سب لوگ اپنے تعلیمی اداروں کی زبوں حالی اور تعلیم کے گرتے ہوئے معیار پر جلتے کڑھتے ہیں طالب علموں کے ہاتھوں میں قلم کی جگہ کلاشن کوف دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں مگر سچ سچ بتائیے کہ ہم لوگ کرتے ہی کیا ہیں سوائے جلنے کڑھنے، پریشان ہونے، یا تشویش کا اظہار کرنے کے .... ہم میں سے کتنے والدین ایسے ہوں گے کہ جو تعلیمی اداروں کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر زبانی جمع خرچ کرنے کے بجائے حالات کو بہتر بنانے کے لئے کوئی عملی تدبیر بھی کرتے ہوں۔

تعلیمی اداروں کے حالات بگاڑنے کے لئے کوئی آسمانی مخلوق الگ سے تو نہیں آتی۔ یہ بگاڑ بالواسطہ یا براہ راست ہماری ذات ہی سے شروع ہوتا ہے .... تعلیمی اداروں میں اسلحہ اٹھا کر چلنے والے، اغوا کرنے والے، مار پیٹ ہنگامہ اور پتھراؤ کرنے والے، بسوں اور گاڑیوں کو نذر آتش کرنے والے یہ سب کون ہیں؟؟؟۔ ہمارے بچے...... ہمارے بہن بھائی، ...... یا کوئی اور؟ اگر یہی ہیں تو پھر یہ بات بھی طے ہے کہ انکی تربیت میں ہم ہی سے کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔

انہی تعلیمی اداروں میں بڑی تعداد ایسے طالب علموں کی بھی ہے جو صرف اور صرف پڑھنے آتے ہیں اور جن کے لئے ہنگامے یا توڑ پھوڑ کا تصور بھی محال ہے...... بات اتنی سی ہے کہ ایسی صالح اولادیں اپنے والدین کی تربیت کا بہترین عکس ہیں جبکہ طالب علم کے روپ میں ادھم مچانے اور ہنگامہ کرنے والے، اپنے والدین کی غفلت اور لاپرواہی کے باعث غلط راستوں پر چل نکلے ہیں۔

ایسا ہوا ہی کیوں؟ یہ بات آپ کے علم میں کیوں نہیں آئی کہ آپ کا نور نظر اپنے تعلیمی ادارے میں جانے کے بعد کیا گل کھلاتا ہے؟ اگر آپ کے بار بار سمجھانے پر بھی وہ کوئی اثر نہیں لیتا تو نافرمانی کی یہ نوبت ہی کیوں آئی؟

غور کیجئے اور ابھی سے فکر کیجئے۔ اپنے چھوٹے بچوں پر کڑی نظر رکھئے انہیں ان حدود سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیجئے جہاں سے بے ادبی اور نافرمانی کا آغاز ہوتا ہے...... اپنے آپ کو ایسا رکھئے کہ آپ کی اولاد ہمیشہ آپ کا احترام کرے آپ کا کہنا مانے اگر آپ نے ایسا کیا تو یقین رکھئے کہ آپ کا بچہ کبھی کتاب پر کلاشن کوف کو ترجیح نہیں دے گا اور اگر ہم سب نے ایسا کیا تو تعلیمی ادارے امن اور علم کا گہوارہ بن جائیں گے

ڈائریکٹوریٹ جنرل نیشنل ہائی وے
پری کوالی فکیشن نوٹسز
انڈس ہائی وے پروجیکٹ۔ فیز۔ ۲

حکومت پاکستان اوور سیز اکنامک کو آپریشن فنڈ، جاپان کی مالی امداد سے انڈس ہائی وے کی بہتری کے کام کا آغاز کر رہی ہے۔

اس کام میں زیادہ سے زیادہ ۵۸۰ کلو میٹر سڑک کی تعمیر کی نگرانی بھی شامل ہے۔ یہ سڑک چھ مرحلوں میں مکمل ہوگی۔

حکومت پاکستان نیشنل ہائی وے بورڈ کے توسط سے دلچسپی رکھنے والی اہل بین الاقوامی مشاورتی فرموں کو پاکستانی فرموں کے ساتھ جوائنٹ وینچ میں شریک ہو کر پری کوالی فائڈ ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ پری کوالی فکیشن کی دستاویزات ۲۰ اگست ۱۹۹۰ء سے ۳۱ اگست ۱۹۹۰ء تک ڈائریکٹر انڈس ہائی وے کے دفتر، ڈائریکٹوریٹ جنرل نیشنل ہائی وے، سیکنڈ فلور، پولیس فاؤنڈیشن بلڈنگ جی ۱۴/ ۱۰ اسلام آباد سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ٹیلی فون نمبر ۸۱۵۶۸۴ ٹیلکس نمبر این ایچ بی پی کے ۵۴۳۷۹

حسن اے شیخ
ڈائریکٹر جنرل
نیشنل ہائی وے بورڈ
پوسٹ بکس ۱۲۰۵
اسلام آباد۔ پاکستان

پی آئی ڈی ۵۹۶/۷۱

ٹینڈر نوٹس

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے منظور شدہ کنٹریکٹروں سے درج ذیل کاموں کے لئے سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینی لاگت	زرِ بیعانہ	قیمت ٹینڈر	کھلنے کی تاریخ
۱۔	شاہرہ ولی اللہ بلاک نمبر ۱۹ اور ۲۰ فیڈرل بی ایریا کی امپرومنٹ اور چوڑائی بڑھانا بذریعہ مشین کارپٹنگ	=/۱۳،۷۳،۲۹۵	=/۲۷،۴۶۶	=/۷۵۰	۵-۹-۹۰
۲۔	تین ہٹی پل سے امام بارگاہ بالمقابل سی ائی ایریا، لیاقت آباد، ایس ایم توفیق روڈ کو بذریعہ مشین کارپٹنگ چوڑا کرنا	=/۹،۱۹،۴۸۴	=/۱۸،۳۹۰	=/۷۵۰	”
۳۔	اسماعیل شہید روڈ، فیڈرل بی ایریا کو بذریعہ مشین کارپٹنگ چوڑا	=/۶،۱۷،۴۴۹	=/۱۲،۳۴۹	=/۷۵۰	”

	کرنا				
	برساتی نالہ بمقام سیکٹر ۵	=/۲،۶۶،۵۵۶	=/۵،۳۳۱	=/۵۰۰	"
۵۔	اے نارتھ کراچی کی تعمیر و امپرووومنٹ رضویہ سوسائٹی اور عثمانیہ سوسائٹی بی روڈ ناظم آباد کی سروس روڈ پر سروس	=/۲،۵۰،۳۳۰	=/۵۰۰۷	=/۵۰۰	"
۶۔	آئی لینڈ اور فٹ پاتھ کی امپرووومنٹ لیاقت آباد سی روڈ کے ساتھ لیاقت آباد نمبر ۱۰ سے گجرونالہ بلاک نمبر ۴ اور ۳ تک سروس روڈ کی امپرووومنٹ اور چوڑائی	=/۲،۴۵،۷۷۶	=/۴۹۱۶	=/۵۰۰	۹۰۔۹۔۵

ٹینڈر و دستاویزات ایگزیکٹو انجینئر کے آفس ڈی ۳ بی اینڈ آر، چیف انجینئر کے ایم سی اور انکوائری آفس کے ایم سی سے درج شدہ قیمت (ناقابل واپسی) ادا کر کے اور زریعانہ بشکل پے آرڈر پیش کر کے ۹ بجے سے ۲ بجے دوپہر تک ٹینڈر کھلنے کی تاریخ کے سوا کسی بھی دن حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

زریعانہ کے طور پر حبیب بنک لمیٹڈ کی کے ایم سی برانچ یا کسی بھی شیڈول بینک کا پے آرڈر ٹینڈر کی دستاویزات کے ہمراہ منسلک کیا جائے ورنہ اس کے بغیر ٹینڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ٹینڈر کے لفافے کو لازماً سربمہر کر کے چیئرمین ٹینڈر اوپننگ کمیٹی نمبر ۱ کے ایم سی کی ہیڈ آفس کے ٹینڈر بکس میں ۹۰-۹-۵ کو ساڑھے گیارہ بجے صبح سے پہلے ڈال ڈیئے جائیں۔ ٹینڈر اس تاریخ کو چیئرمین ٹینڈر اوپننگ کمیٹی نمبر ۱ (ڈپٹی چیف انجینئر نمبر ۱ کے ایم سی) موجود رہنے کے خواہشمند ٹینڈر دہندگان کے سامنے کھولیں گے۔

کے ایم سی وجہ بتائے بغیر کوئی بھی ٹینڈر قبول یا مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

KMC - ۴۳۰/۹۰
۱۸۶/KR/۴۰۵۴

ای ایس انجینئر ڈی III بی اینڈ آر کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن

نوٹس برائے تعمیر ایمرجنسی

زینہ جات شہید ملت

سیکرٹریٹ اسلام آباد

پاک پی ڈبلیو ڈی، سی ڈی اے، ایم ای ایس کے منظور شدہ اچھی ساکھ کے حامل کنٹریکٹروں اور کمپنیوں سے جنہیں ڈبلیو/ایس، ایس/آئی اور بجلی کے کاموں کا تجربہ ہو. شہید ملت سیکرٹریٹ اسلام آباد میں برائے تعمیر ایمرجنسی زینہ جات ٹینڈر دینے کی کوالی فیکشن کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔ منصوبے پر خرچ کا تخمینہ چھیالیس لاکھ چودہ ہزار ہے۔

دلچسپی رکھنے والے کنٹریکٹر حضرات اپنی درخواستیں درج ذیل معلومات/دستاویزات کے ساتھ ۱۸ اگست ۱۹۹۰ء تک زیر دستخطی کو ارسال کریں۔ تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستیں قابل قبول نہیں ہوں گی۔

۱۔ مرکزی شخصیت کے نام کے ساتھ کنٹریکٹروں/فرموں/یا کمپنیوں کے نام۔
۲۔ ہیڈ آفس اور برانچوں کا محل وقوع۔
۳۔ بجلی کے کاموں، ڈبلیو/ایس، ایس/آئی (اگر ہو) کے لئے متعلقہ شریک کار کمپنیوں کے کوائف۔
۴۔ رجسٹریشن/انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے کلیرنس سرٹیفکیٹ۔
۵۔ ٹیکنیکل اسٹاف کی فہرست مع تعلیمی اہلیت و تجربہ۔
۶۔ ان بڑے کاموں کی فہرست جو گزشتہ پانچ برسوں میں انجام دیئے ہوں۔

۷۔ پلانٹ/ مشینری اور دستیاب آلات کی فہرست
۸۔ مالی استطاعت سے متعلق بینک سرٹیفکیٹ۔
۹۔ مقدمات اور تصفیوں وغیرہ کی تفصیلات۔
۱۰۔ دستیاب شٹرنگ میٹریل اور اس کے فولڈنگ میٹریل کی فہرست۔
۱۱۔ زیر تکمیل کام کی تفصیلات۔
۱۲۔ پاکستان انجینئرنگ کونسل سے رجسٹریشن کے کوائف۔
۱۳۔ اس امر کا صداقت نامہ کہ کمپنی کو کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارے نے بلیک لسٹ نہیں کیا۔
۱۴۔ مختلف محکمہ جات میں موجودہ رجسٹریشن کی نقول۔

نوٹ:

جو کمپنیاں پہلے سے کوالی فائڈ ہوں اور ان کے نام پاک پی ڈبلیو کے پاس رجسٹرڈ نہ ہوں انہیں اپنے نام وہاں رجسٹر کرانے ہوں گے۔

افسر مجاز یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ پری کوالی فیکشن کے لئے موصولہ کسی بھی درخواست کو کوئی وجہ بتائے بغیر مسترد کر دیں۔

ایگزیکٹو انجینئر
سینٹرل سول ڈویژن نمبر ۳
پاک پی ڈبلیو ڈی، اسلام آباد
فون: ۸۲۶۹۹۲

پی آئی ڈی ۹/ ۴۸۷

ٹینڈر نوٹس

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن

کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کے منظور شدہ کنٹریکٹروں سے درج ذیل کاموں کے لئے سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں

نمبر شمار	کام کا نام	تخمینی لاگت	زر بیانہ	قیمت ٹینڈر	کھلنے کی تاریخ
۱۔	ناظم آباد گول مارکیٹ کے اطراف دکانوں کے سامنے سی سی پیسیج کی تعمیر و امپروومنٹ	۱،۱۶،۴۴۵/=	۲،۳۲۹/=	۲۰۰/=	۹-۹-۹۰
۲	ایس ایم توفیق روڈ لیاقت آباد پر ریاض گرلز کالج کے سامنے آئی لینڈ فٹ پاتھ کی پی/ایل سی سی ٹائلز فلورنگ اور گرل فٹنگ کے ذریعے امپروومنٹ	۹۰،۲۲۷/=	۱،۸۰۵/=	۲۰۰/=	"
۳	شاہراہ شیر شاہ سوری نارتھ ناظم آباد پر قصر شیریں سے کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے دفتر تک سی سی فٹ پاتھ بشمول سروس آئی لینڈ کی امپروومنٹ	۸۳۵۱۸/=	۱،۶۷۰/=	۲۰۰/=	"

۴	شاہراہ ہمایوں پر فتح باغ کے نزدیک سی سی فٹ پاتھ کی امپرووومنٹ	=/۶۳،۲۵۸	=/۱،۲۶۵	=/۲۰۰	"
۵	شاہراہ چشتی نارتھ ناظم آباد پر باچاخان سے عبداللہ گرلز کالج تک سڑک کی امپرووومنٹ	=/۵۶،۹۱۵	=/۱،۱۳۸	=/۲۰۰	"
۶	نواب صدیق علی خان روڈ پر لسبیلہ پل سے ناظم آباد پہلی چورنگی تک سڑک کی امپرووومنٹ	=/۴۱،۹۳۲	=/۸۳۹	=/۱۰۰	"
۷	ناظم آباد نمبر ا علامہ عثمانی لائبریری کی مینٹیننس اور مرمت	=/۳۵،۳۱۶	=/۷۰۶	=/۱۰۰	"
۸	نارتھ ناظم آباد تیموریہ لائبریری کی مینٹیننس و مرمت	=/۳۱،۲۳۷	=/۶۲۵	=/۱۰۰	"

ٹینڈر دستاویزات ایگزیکٹو انجینئر کے آفس ڈی ۳ بی اینڈ آر چیف انجینئرز کے ایم سی اور انکوائری آفس کے ایم سی درج شدہ قیمت (ناقابل واپسی) ادا کر کے اور زریمانہ شکل پے آرڈر پیش کر کے ۹ بجے ۳ بجے دوپہر تک ٹینڈر کھلنے کی تاریخ کے سوا کسی بھی دن حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

منسلک کیا جائے ورنہ اس کے بغیر ٹینڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ٹینڈر چیف انجینئر ڈی ۳ بی اینڈ آر کے ایم سی مقررہ تاریخ ساڑھے گیارہ بجے صبح موقع پر موجود ہونے کے خواہش مند کنٹریکٹروں کے سامنے کھولیں گے۔

کے ایم سی کسی بھی ٹینڈر کو وجہ بتائے بغیر قبول یا مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔

(ایگزیکٹو انجینئرز ڈی ۳ بی اینڈ آر
کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن

کے ایم سی ۴۳۱/۹۰ آئی این ایف کے آر ڈوائی ۴۰۵۵

وطن سے دور اہل وطن کا ساتھی

اوورسیز پاکستانیز فاؤنڈیشن

پولی ٹریڈ اسکول ماڈل ویلج پیپری کراچی میں ٹی۔ ایس۔ سی (میٹرک ٹیکنیکل) کورس میں

داخلہ جاری ہے

او۔ پی۔ ایف کے زیر انتظام پولی ٹریڈ سکول میں ٹیکنیکل سکول سرٹیفکیٹ کے کورس میں داخلہ کے لئے درج شرائط کے تحت خواہشمند امیدواروں سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

(۱) مڈل پاس امیدوار جو فنی کام سیکھنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

ٹیکنیکل سکول سرٹیفکیٹ (نویں جماعت فنی) میں داخلہ کے لئے درخواست دے سکتے ہیں۔

(۲) داخلے کے خواہشمند طلبا کی عمر ۱۳ سے ۱۶ سال کے درمیان ہو اور داخلے کا امتحان پاس کرنے کے اہل ہوں۔

(۳) داخلہ امتحان پاس کرنے کے بعد امیدوار کو مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک ٹریڈ میں داخلہ دیا جائے گا۔

(الف) جنرل الیکٹریشن (ب) ویلڈنگ (ج) ریفریجریشن / ایئر کنڈیشننگ سندھ بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کراچی کے سالانہ امتحان ۱۹۸۹ء میں ویلڈنگ ٹریڈ کے تین طلبا نے پہلی۔ دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی ہیں۔

میٹرک ٹیکنیکل (ٹی۔ ایس۔ سی) کے پاس شدہ طلباء کو پولی ٹیکنیک اداروں میں داخلے کے لئے ترجیح دی جاتی ہے۔

ڈسٹرکٹ کونسل کی طرف سے دیہات کے طلباء کو ایک ہزار روپے وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے زیر دستخطی یا او۔ جی۔ ایف کے علاقائی دفتر ۲۱۲ ڈی۔ کے۔ ڈی۔ اے اسکیم ون۔ اے کراچی فون نمبر ۴۲۱۲۶۴ پر رابطہ قائم کریں۔

درخواستیں بغیر لیٹ فیس کے ۱۵ اگست ۱۹۹۰ء تک وصول کی جائیں گی اور لیٹ فیس کے ہمراہ ۹۰۔ ۸۔ ۳۱ تک وصول کی جائیں گی۔

پی آئی ڈی ۱۹/ ۴۵۵

پرنسپل
پولی ٹریڈ اسکول
معرفت پی۔ او۔ بکس ۹۰۱۵ قائد آباد لانڈھی کراچی نمبر ۲۲

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. No. M-266 SEPTEMBER 1990

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI